داعیٔ رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(گیارہواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(آٹھواں ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 485 روپے

حصہ پنجم سُورۃ مَریَم تا سُورۃ السَّجدۃ
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

حصہ ہفتم سُورۃ قٓ تا سُورۃ النّاس
(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات 560، قیمت 650 روپے

ناشر انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

ڈسٹری بیوٹر مکتبہ خدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

ذوالقعدہ ۱۴۳۶ھ
ستمبر ۲۰۱۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اسلام میں عدل و انصاف کی اہمیت
اور
اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی
بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 64

شمارہ : 9

ذوالقعدہ 1436ھ

ستمبر 2015ء

فی شمارہ 30/-

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	300 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

اُردش

ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ——— 9

سورۃ الحج (آیات ۱ تا ۳۳)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالعۂ حدیث ——— 29

اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت اور اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اعتصامش کن ..... ——— 45

ہجر قرآن اور اس کے مختلف مظاہر

جمیل الرحمٰن عباسی

تذکّر و تدبّر ——— 57

قرآن کریم کی اصولی باتیں

ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

یادِ رفتگاں ——— 68

حافظ نوید احمد منزل پا گئے!

ڈاکٹر ضمیر اختر خان

تعلیم و تعلّم ——— 71

روحانی باپ کی ناقدری کا بڑھتا ہوا رجحان

عتیق الرحمٰن قریشی

تحدیثِ نعمت ——— 77

میری خوش نصیبی.....الحمدللہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

سبق پھر پڑھ ——— 85

تاریخِ خلافت

شجاع الدین شیخ

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اُردش

قائداعظم کا یہ فرمان کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی‘ ۱۹۷۳ء تک تو ہوا میں معلق رہا پھر نئے آئین کی دفعہ ۲۵۱ میں یہ ثبت کر دیا گیا کہ پندرہ سال میں پورے پاکستان کی دفتری زبان اردو ہوگی۔ گویا ۱۹۸۸ء سے ہم آئین کی خلاف ورزی پابندی سے کر رہے ہیں اور وہ سب خاموش ہیں جو اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے شب و روز آئین کی بالادستی کی رَٹ لگاتے ہیں اور دوسروں کو آئین کی خلاف ورزی پر دفعہ ۶ کی یاددہانی کراتے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں یعنی قیامِ پاکستان کے فوری بعد سر آغا خان‘ جن کا قیامِ پاکستان کے حوالے سے انتہائی اہم اور کلیدی رول تھا اور زاہد حسین جو بعد ازاں سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر بنے‘ ان دونوں ممتاز شخصیات نے بڑے پرزور انداز میں قائد اعظم کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان قرار دے دیا جائے‘ لیکن افسوس صد افسوس اس تجویز کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اُس وقت ایک نوزائیدہ ریاست تھی اور اہل پاکستان کی کیفیت نوزائیدہ بچوں کی طرح تھی‘ اس وقت اگر اس تجویز کو قبول کر لیا جاتا اور تعلیمی اداروں میں فی الفور عربی کی تعلیم لازم قرار دے دی جاتی اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد سرکاری ملازمت کے لیے عربی بول چال اور تحریری اہلیت لازم ہو جاتی تو آج ہم انگریزی سے کہیں بہتر عربی تحریر و تقریر کی اہلیت کے حامل ہوتے۔ ہمیں اس حوالہ سے غیبی مدد بھی پہنچتی کیونکہ عربی اللہ تبارک وتعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید فرقان حمید کی زبان ہے اور ہم سب کے آقا حضرت مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی پیاری زبان بھی ہے یہ ہم خرما و ہم ثواب کا معاملہ ہوتا۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ نہ پاکستان دولخت ہوتا نہ ملک بھر میں کہیں لسانی فسادات ہوتے اور نہ ہی ایم کیو ایم کے وجود کا کوئی جواز ہوتا کیونکہ پاکستان کے قیام کی اصل اور حقیقی بنیاد اسلام تھی اور اسلام سے تعلق بنگالی کا بھی اُتنا ہی تھا جتنا پٹھان‘ سندھی اور پنجابی کا تعلق تھا‘ پھر یہ سوال نہ ہوتا کہ ان کی زبان کیوں ہماری کیوں نہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مادری زبان کا مسئلہ بڑا حساس ہوتا ہے۔ اس سے گہرا ذہنی اور مزید گہرا قلبی تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قائداعظم اردو کے قومی زبان ہونے کا اعلان کر کے ڈھاکہ پہنچے تو اُن کے خلاف بنگالیوں نے احتجاج کیا اور یہ واحد احتجاج تھا جو قائداعظم کے خلاف ہوا تھا حالانکہ وہ بابائے قوم تھے۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ مسلم لیگ کی بنیاد بنگال میں رکھی گئی تھی اور تحریکِ پاکستان نے بنگال میں کتنی شدت اختیار کی تھی۔ پھر بھی زبان کے مسئلہ پر احتجاج ہوا اس لیے کہ بنگالیوں کے لیے بنگالی اُتنی ہی محترم اور مقدس ہے جتنی اُس دور کے اہلِ دہلی کے لیے اُردو تھی جہاں سے مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہجرت کر کے پاکستان آئی تھی۔ بنگالیوں کے نقطہ نظر سے سوچیے تو اُن کا طرزِ عمل کوئی ایسا غلط بھی نہ تھا۔ بہرحال‘ رات گئی بات گئی‘ عربی ہماری قومی زبان نہ بن سکی۔

پاکستان بچپن سے لڑکپن اور جوانی سے گزر کر اُدھیڑ عمری کی طرف گامزن ہے۔ اگرچہ ہم عادات اور اطوار کے لحاظ سے لڑکپن پر ہی جم کر بیٹھ گئے ہیں‘ لیکن وقت کہاں کسی کا انتظار کرتا ہے۔ اب بوڑھے طوطے کیسے پڑھیں گے لہٰذا ہمارے پاس اُردو کو عملی طور پر قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے وگرنہ ہم جیسے سیاسی اور معاشی طور پر بے زبان ہو چکے ہیں (یعنی سیاسی اور معاشی جانور بن چکے ہیں اور غیر ہمیں جس سمت چاہیں ہانکتے رہتے ہیں)‘ ادبی اور ثقافتی طور پر بھی بے زبان ہو جائیں گے اور مجھے شدید اندیشہ ہے کہ ہم اپنی شناخت بھی کھو دیں گے۔ ایک عجیب مگر دکھ دینے والی بات یہ ہے کہ جب ہم انگریز کے غلام تھے تب انگریزی بولنے والوں سے ہم اتنے مرعوب نہیں ہوتے تھے جتنے آج آزادی کے اڑسٹھ سال بعد ہم مرعوب نظر آتے ہیں۔ پڑھائی لکھائی اور علم کو انگریزی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ گورے انگریز کے بعد ہم نے عنان حکومت کالے انگریز کے حوالے کر دی اور اُس کی دلچسپی اور مفاد اسی میں تھا کہ گورے انگریز کی چھڑی اب وہ تھام لے اور ماضی کی طرح ہمیں ہانکتا رہے۔ اُس کے لیے ضروری تھا کہ وہ انگریزی زبان استعمال کر کے اپنا رعب اور دبدبہ قائم کرے‘ لہٰذا موجودہ حکمران جو اگرچہ ہمارے بھائی ہیں‘ ہم وطن ہیں‘ مسلمان ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ انگریزی کو حکمرانی کا ہتھیار بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔

انگریزی زبان کو جاری و ساری رکھنے کی دوسری وجہ ہمارے حکمرانوں کا احساسِ کمتری ہے‘ ملک میں سیاسی عدم استحکام اور خود پیدا کردہ معاشی احتیاج نے اس احساسِ کمتری کو جنم دیا

ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے جب یہ بات ممکن بنادی ہے کہ عالمی سطح پر تسلیم شدہ زبانوں کا ترجمہ آپ کی تقریر کے ساتھ ساتھ ہی سامعین تک پہنچ رہا ہوتا ہے' ایسی صورت میں آپ اس زبان میں بات کیوں نہیں کرتے جسے آپ کے آئین نے آپ پر لازم کیا ہے اور اسی آئین کے تحت آپ نے اپنے سرکاری عہدہ کا حلف اُٹھایا ہے اور اُسے پاکستان کی قومی زبان قرار دیا ہے۔ اندرون ملک تو خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا ہے اور ہم نئے چیف جسٹس آف پاکستان خواجہ ایس جواد کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے انگریزی میں حلف اُٹھانے کی رسم کو توڑا اور اپنی قومی زبان اُردو میں حلف اُٹھایا ہے۔ ہمیں صرف حکومت ہی سے یہ مطالبہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اردو کو نافذ کرے بلکہ عوامی سطح پر بھی ایک مہم چلانا ہوگی۔ لوگ اپنی دکانوں کے بورڈ' گھروں کی نیم پلیٹ اردو میں لکھوائیں' شادی کارڈ وغیرہ اردو میں پرنٹ کروائے جائیں اور اس احساسِ کمتری سے نکلیں کہ صرف انگلش میڈیم سکولوں میں ہی ایسی تعلیم مل سکتی ہے جس سے بچہ دنیوی ترقی کی منازل طے کرے گا۔

یہ بات تو قارئین کے علم میں ہوگی کہ عدالت عظمیٰ اُردو زبان کو دفتری زبان بنانے اور اس آئینی تقاضے کو اَحسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے مخلصانہ کوشش شروع کر چکی ہے اور چیف جسٹس کا اردو میں حلف اٹھانا ان ہی کوششوں کا حصہ ہے' لیکن حکومتی اور بعض غیر حکومتی ذرائع اُردو کے خلاف انتہائی خوفناک سازش تیار کر چکے ہیں۔ حال ہی میں اسلام آباد میں ''علم پاکستان موومنٹ'' کے زیر اہتمام ایک اجلاس میں ہمارے مرکزی وزیر برائے منصوبہ بندی اور ڈویلپمنٹ احسن اقبال صاحب نے بھی خطاب فرمایا ہے اس میں سامعین کو یہ بتایا گیا ہے کہ حکومت اُردیش ذریعہ تعلیم متعارف کروائے گی جو انگریزی اور اُردو کا حسین امتزاج ہوگا۔ احسن اقبال صاحب فرماتے ہیں اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں اردو ذریعہ تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے جھگڑے سے نجات مل جائے گی۔ ہماری رائے میں یہ اُردو کے خلاف ایک خوفناک سازش ہے۔ یہ ایک ایسی سازش ہے جس سے اردو کا حلیہ اس قدر بگاڑ دیا جائے گا بلکہ صحیح تر الفاظ میں اردو کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ جو ''اُردیش'' کا لفظ بنایا گیا ہے اس میں اردو کی ''و'' کو کاٹ کر اس کی جگہ انگلش کی ''اِش'' لگا دی گئی ہے۔ قارئین نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ SMS اور ای میلز میں اردو کو انگریزی میں لکھنے کی رسم کس قدر عام ہوگئی ہے اور یہی انداز اختیار کر کے ہندوستان' جسے اُردو کا گھر کہا جائے' کے بارے میں یہ کہنا

غلط نہ ہوگا کہ وہاں سے اردو رسم الخط کو ختم کر دیا گیا ہے۔ یہی کام ترکی میں کیا گیا اور عربی رسم الخط کو ختم کیا گیا۔ آج جب ہم اُردو کو قومی اور دفتری زبان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہمیں دشمنوں کی طرف سے اردو کی جان ہی کو خطرہ لاحق ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ اردیش کے رواج سے جس کے بارے میں ہمارے وزیر صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ اُردو انگریزی ذریعہ تعلیم کا جھگڑا ختم کر دے گی' حقیقت میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُردو کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ جدید علوم جاننے اور سیکھنے کے لیے انگریزی ذریعہ تعلیم مجبوری ہے' میں صرف یہ سوال پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ چین' جرمن اور فرانس وغیرہ نے جدید علوم کیا انگریزی میں جانے اور سیکھے ہیں؟ غیر منقسم ہندوستان کی ریاست حیدر آباد دکن نے سائنسی علوم کا اُردو ترجمہ کیا تھا یہاں تک کہ اصطلاحات کا بھی ترجمہ کر دیا تھا۔ آخر آج یہ ہمارے لیے کیوں ممکن نہیں۔ چین کے وزیر اعظم چواین لائی بہت اچھی انگریزی جانتے تھے لیکن کسی بھی فورم پر کسی بھی صورت میں انگریزی نہیں بولتے تھے بلکہ اپنی قومی زبان چینی میں تقریر کرتے تھے اور مترجم کی مدد لیتے تھے' البتہ کئی مرتبہ غلط ترجمہ کرنے پر مترجم کی غلطی نکالتے تھے۔

آخر میں ایک سوال سوچ بچار کے لیے قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں' وہ یہ کہ ہم کہتے ہیں کہ اردو ہماری پاکستانیت کی شناخت ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس پاکستان کی شناخت اردو ہے اس پاکستان کی بنیاد اسلام تھی' اگر پاکستان سے عملی طور پر اسلام غائب کر دیا جائے گا تو پاکستان کس بنیاد پر قائم رہے گا اور یہ بے بنیاد پاکستان کب تک خود کو قائم رکھ سکے گا جس کی شناخت اردو ہے۔ ❁❁❁

1

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الحَجّ

تمہیدی کلمات

سورۃ الحج کو بعض مفسّرین مدنی سورت مانتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں منافقین کا ذکر بھی ہے اور جہاد و قتال کے احکام بھی ہیں' اور یہ دونوں موضوعات مدنی سورتوں میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سورت کی بعض آیات کی سورۃ البقرۃ (مدنی) کی آیات کے ساتھ بہت گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس ضمن میں مجھے ان مفسرین سے اتفاق ہے جو اسے مکی سورت قرار دیتے ہیں۔ البتہ اس کی کچھ آیات یا تو سفرِ ہجرت کے دوران نازل ہوئیں یا حضور ﷺ کے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد (مطالعہ کے دوران متعلقہ آیات کی نشان دہی کی جائے گی)۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آیات مکّی آیات سے مختلف نظر آتی ہیں۔

آیات ۱ تا ۱۰

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱ يَوْمَ تَرَوْنَهَا
تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى
النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲ وَمِنَ النَّاسِ
مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝۳ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ
مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۴ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ
فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ

مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى
الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ
زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝۶ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝۷
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۸ ثَانِيَ
عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱﴾ ''اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا' یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔''

سورۃ الانبیاء کا اختتام ''الفَزَعُ الاکبر'' (قیامت کی عظیم پریشانی) کے تذکرے پر ہوا تھا۔ اب سورۃ الحج کا آغاز بھی اسی کیفیت کے ذکر سے ہو رہا ہے۔

آیت ۲ ﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾ ''جس دن تم اُس کو دیکھو گے' اس دن (حال یہ ہوگا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی''

ماں کی ممتا کا جذبہ ضرب المثل ہے۔ ایک ماں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بھی اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے اور اس پر کسی صورت آنچ نہیں آنے دیتی۔ اپنے بچے سے محبت کا یہ جذبہ حیوانوں میں بھی اسی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ البتہ قیامت کا دن ایسا سخت ہوگا کہ اس کے خوف و ہراس کے باعث دودھ پلانے والی مائیں' چاہے وہ انسان ہوں یا حیوان' اپنے دودھ پیتے بچوں کو بھول جائیں گی۔

﴿وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا﴾ ''اور (دہشت کا عالم یہ ہوگا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا''

﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲﴾ ''اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ

کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔''

وہ گھڑی ایسی خوف ناک ہوگی کہ اس کی دہشت سے لوگ بے سدھ پڑے نظر آئیں گے۔ بہر حال حدیث میں واضح طور پر یہ خوشخبری سنائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمنین صادقین بندوں کو اس دن کی سختیوں سے دور رکھیں گے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

آیت ۳ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ﴾

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی علم کے' اور وہ پیروی کر رہے ہوتے ہیں ہر سرکش شیطان کی۔''

آج کے نام نہاد مذہبی سکالرز اور دانشور بھی اس آیت کا مصداق ہیں' جو عملی طور پر غیر مسلم مغربی تہذیب کی نقالی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ ذہنی طور پر مغربی افکار و نظریات سے مرعوب ہیں اور ان نظریات کا ہر طریقے سے پرچار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حدیث کی ضرورت و اہمیت کے سرے سے منکر ہیں۔ ان کی روشن خیالی انہیں باور کراتی ہے کہ قرآنی احکام صرف ایک زمانے تک قابل قبول تھے اور انسان کے لیے ہمیشہ ان کا پابند رہنا ممکن نہیں۔ لہٰذا نئے زمانے کی ضروریات کے مطابق قرآنی آیات کو (معاذ اللہ!) over rule کر کے اجتہاد کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ایک ایسے ہی پاکستانی سکالر تھے' جو McGill یونیورسٹی (مانٹریال' کینیڈا) سے فارغ التحصیل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن آنحضور ﷺ کا کلام بھی ہو سکتا ہے اور اللہ کا بھی۔ اسی قبیل کے ایک ایرانی سکالر سید حسین نصر بھی ہیں۔ ایسے لوگ یہودی اداروں سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں اور پھر ساری عمر یہودیوں سے حقِ وفاداری نبھانے میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وائٹ ہاؤس سے بھی خصوصی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

آیت ۴ ﴿كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ﴾ ''اس (شیطان) کے بارے میں تو لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی بھی اس کی دوستی اختیار کرے گا' وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا''

﴿وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝﴾ ''اور اس کو پہنچا کر رہے گا دوزخ کے عذاب تک۔''

آیت ۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾

''اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں شک ہے تو (ذرا غور کرو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا''

انسانی جسم کی اصل مٹی ہے۔ اس کی غذا بھی نباتات اور معدنیات کی شکل میں مٹی ہی سے آتی ہے۔ اگر وہ کسی جانور کا گوشت کھاتا ہے تو اس کی پرورش بھی مٹی سے حاصل ہونے والی غذا سے ہی ہوتی ہے۔

﴿ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ ''پھر نطفے سے''

اور یہ مادہ بھی اسی جسم کی پیداوار ہے جو مٹی سے بنا اور مٹی سے فراہم ہونے والی غذا پر پلا بڑھا۔

﴿ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ﴾ ''پھر علقہ سے''

عام طور پر ''علقہ'' کا ترجمہ ''جما ہوا خون'' کیا جاتا ہے جو درست نہیں ہے۔ اس لفظ کی وضاحت سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۴ کے ضمن میں آئے گی۔

﴿ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ ''پھر گوشت کے لوتھڑے سے' واضح شکل والا اور غیر واضح شکل والا''

پہلے مرحلے میں اس لوتھڑے پر کسی قسم کے کوئی نشانات نہیں تھے۔ پھر رفتہ رفتہ مختلف مقامات پر نشانات بننے لگے۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی جگہوں پر دو دو نشانات بنے اور اسی طرح دوسرے اعضاء کے نشانات بھی اُبھرنا شروع ہوئے۔

﴿لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ﴾ ''تاکہ ہم کھول کھول کر بیان کر دیں تمہارے لیے''

تاکہ رحم مادر میں انسانی جنین پر گزرنے والے مختلف مراحل کے بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ تم لوگوں کو بتا دیا جائے۔ تعارفِ قرآن (بیان القرآن' جلد اوّل) کے باب پنجم میں علم جنین (Embryology) کے ماہر سائنسدان کیتھ ایل مور (کینیڈا) کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس مضمون پر اس شخص کی ٹیکسٹ بکس دنیا بھر میں مستند مانی جاتی ہیں اور یونیورسٹی کی سطح تک پڑھائی جاتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآن نے رحم مادر میں جنین کے مختلف مراحل کو جس طرح بیان کیا ہے اس موضوع پر دستیاب معلومات کی اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں ہے۔ مزید برآں وہ اس امر پر حیرت کا اظہار بھی کرتا ہے کہ صدیوں پہلے قرآن میں ان مراحل کا درست ترین تذکرہ کیونکر ممکن ہوا۔

﴿وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ ''اور ہم ٹھہرائے رکھتے ہیں

رحموں کے اندر جو ہم چاہتے ہیں ایک وقتِ معیّن تک‘‘

3 یعنی رحم کے اندر حمل ویسا ہوتا ہے جیسا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ یہ فیصلہ صرف وہی کرتا ہے کہ وہ بچہ مذکر ہوگا یا مؤنث‘ ذہین وفطین ہوگا یا کند ذہن‘ خوبصورت ہوگا یا بدصورت‘ تندرست و سالم ہوگا یا بیمار و معذور۔ اس معاملے میں کسی کی خواہش یا کوشش کا سرے سے کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس مضمون کے بارے میں سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع میں مزید تفصیل بیان ہوگی۔

﴿ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ﴾ ’’پھر ہم نکالتے ہیں تمہیں چھوٹے سے بچے کی صورت میں‘ پھر تم پہنچتے ہو اپنی جوانی کو۔‘‘

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ﴾ ’’اور تم میں وہ بھی ہیں جو پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو نکمی عمر تک لوٹائے جاتے ہیں‘ کہ اُسے کچھ بھی علم نہ رہے سب کچھ جاننے کے بعد۔‘‘

’’اَرْذَلِ الْعُمُر‘‘ کی کیفیت سے حضور ﷺ نے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ بڑھاپے میں بعض اوقات ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ انسان demencia کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اس کی ذہنی صلاحیتیں جواب دے جاتی ہیں‘ یادداشت زائل ہو جاتی ہے اور وہی انسان جو اپنے آپ کو کبھی سقراط اور بقراط کے برابر سمجھتا تھا‘ بچوں کی سی باتیں کرنے لگتا ہے۔ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کیفیت کو پہنچنے سے پہلے ہی اس دنیا سے اٹھا لے۔ میں نے ذاتی طور پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مرحوم کو بڑھاپے کی اس کیفیت میں دیکھا ہے۔ آخری عمر میں ان کی کیفیت ایسی تھی کہ نہ زندوں میں تھے‘ نہ مُردوں میں۔ دیکھنے والے کے لیے مقامِ عبرت تھا کہ ایک ایسا شخص جو اعلیٰ درجے کا خطیب تھا اور اس کے قلم میں بلا کا زور تھا‘ عمر کے اس حصے میں بے چارگی و بے بسی کی تصویر بن کر رہ گیا تھا اور اپنے پاس بیٹھے لوگوں کو پہچاننے سے بھی عاجز تھا۔ میں اس زمانے میں انہیں ملنے کے لیے ان کے پاس جاتا تھا مگر ایک حسرت لے کر واپس آ جاتا تھا۔

مولانا صاحب کی تفسیر ’’تدبّرِ قرآن‘‘ بلاشبہ بہت اعلیٰ پائے کی تفسیر ہے۔ اس میں انہوں نے ’’نظام القرآن‘‘ کے حوالے سے اپنے استاد حمید الدین فراہیؒ کی فکر اور ان کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ میں نے ذاتی طور پر اس تفسیر سے بہت استفادہ کیا ہے‘ لیکن مجھے مولانا سے بہت سی باتوں میں اختلاف بھی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ رجم کی سزا سے متعلق رائے دینے میں ان سے

بہت بڑی خطا ہوئی ہے۔ (وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ النور‘ تشریح آیت ۲) اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔ مولانا کا ذکر ہوا ہے تو ان کے لیے دعا بھی کیجیے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِی رَحْمَتِكَ وَحَاسِبْہُ حِسَابًا یَسِیْرًا۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ مَرْقَدَہٗ وَاَکْرِمْ مَنْزِلَہٗ وَاَلْحِقْہُ بِعِبَادِكَ الصَّالِحِین۔ آمین یا ربَّ العالَمین!

زیرِ نظر آیت کے الفاظ پر دوبارہ غور کریں۔ یہاں انسانی زندگی کا پورا نقشہ سامنے رکھ کر بعثِ بعد الموت کے منکرین کو دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ ہماری قدرت کا مشاہدہ کرنا چاہو تو تم اپنی زندگی اور اس کے مختلف مراحل پر غور کرو۔ دیکھو! تمہاری ابتدا مٹی سے ہوئی تھی۔ اس مٹی سے پیدا ہو کر تم لوگ کس کس منزل تک پہنچتے ہو‘ اور پھر آخر مر کر دوبارہ مٹی میں مل جاتے ہو۔ جس اللہ نے تمہیں یہ زندگی بخشی‘ تمہیں بہترین صلاحیتوں سے نوازا‘ جس کی قدرت سے انسانی زندگی کا یہ پیچیدہ نظام چل رہا ہے‘ کیا تم اُس کی قدرت اور خلاقی کے بارے میں شک کر رہے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ پیدا نہیں کر سکے گا۔ اپنی زندگی کی اس مثال سے اگر حقیقت تم پر واضح نہیں ہوئی تو ایک اور مثال پر غور کرو:

﴿وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ ’’اور تم دیکھتے ہو زمین کو خشک (اور ویران)‘ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلاتی ہے اور اُبھرتی ہے‘‘

اھتزاز کے معنی حرکت اور جنبش کرنے کے ہیں۔ اسی سے لفظ تَھْتَزُّ سورۃ النمل‘ آیت ۱۰ اور سورۃ القصص‘ آیت ۳۱ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے بارے میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب اپنا عصا زمین پر رکھا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے چلنے لگا۔ چنانچہ یہاں ’’اِھْتَزَّتْ‘‘ کا مفہوم یہ ہے کہ بارش کے اثرات سے زمین میں زندگی کی لہر دوڑ گئی‘ مردہ زمین یکایک زندہ ہو گئی اور اس میں حرکت پیدا ہو گئی۔ مختلف نباتات کی اَن گنت کونپلیں جگہ جگہ سے زمین کو پھاڑ کر باہر نکلنا شروع ہو گئیں اور پھر وہ سبزہ لمحہ بہ لمحہ نشوونما پانے لگا۔

﴿وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۵﴾ ’’اور قسم قسم کی تر و تازہ چیزیں اُگا دیتی ہے۔‘‘

نباتات کی زندگی کا دورانیہ (cycle) بہت مختصر ہوتا ہے‘ اس لیے تم اکثر اس کا مشاہدہ کرتے ہو۔ اپنے اسی مشاہدے کی روشنی میں تم لوگ اگر اپنی زندگی کے شب و روز کا جائزہ لو گے تو تمہیں انسانی اور نباتاتی زندگی میں گہری مشابہت نظر آئے گی۔ مردہ زمین میں زندگی کے

آثار پیدا ہونے' نباتات کے اگنے' نشوونما پانے' پھولنے پھلنے اور سوکھ کر پھر بے جان ہو جانے کا عمل گویا انسانی زندگی کے مختلف مراحل مثلاً پیدائش' پرورش' جوانی' بڑھاپے اور موت ہی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس میں صرف دورانیے کا ہی فرق ہے۔ نباتاتی زندگی کا دورانیہ چند ماہ کا ہے جبکہ انسانی زندگی کا دورانیہ عموماً پچاس' ساٹھ' ستر یا اسّی سال پر مشتمل ہے۔

آیت ۶ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ ''یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے''

اللہ تعالیٰ کے حق ہونے میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

﴿وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴿۶﴾﴾ ''اور یہ کہ وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے (یا کرے گا) اور یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

بارش کے پانی سے مردہ زمین کے یکایک زندہ ہو جانے کا منظر تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک دن تم لوگوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھا کھڑا کرے گا۔

آیت ۷ ﴿وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾﴾ ''اور یہ کہ قیامت آ کر رہے گی' اس میں کوئی شک نہیں' اور یہ کہ اللہ اٹھائے گا ان کو جو قبروں میں ہیں۔''

بعث بعد الموت کا یہ واقعہ لازماً ہو کر رہے گا۔

آیت ۸ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۸﴾﴾ ''اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے' حالانکہ نہ اُس کے پاس علم ہے' نہ کوئی ہدایت ہے اور نہ کوئی روشن کتاب ہے۔''

ایسے لوگ بغیر کسی علمی دلیل اور الہامی رہنمائی کے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

آیت ۹ ﴿ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''(تکبر سے) اپنی کروٹ موڑ کر (چل دیتا ہے) تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کرے۔''

﴿لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۹﴾﴾ ''اُس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے' اور قیامت کے دن ہم اُسے جلانے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔''

آیت ۱۰ ﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۰﴾﴾ ''(اور اسے کہا

جائے گا کہ) یہ سب کچھ تیرے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کی وجہ سے ہے' اور یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

آیات ۱۱ تا ۲۴

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۱۸﴾ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۫ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْۤا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

آیت ۱۱ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ﴾ ’’اور لوگوں میں سے کوئی وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے پر رہ کر۔‘‘

انسانی دل کے اس روگ کی نشان دہی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ ’’ان کے دلوں میں مرض ہے‘‘۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کا ساتھ دینا تو چاہتے ہیں‘ لیکن اس کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کو تیار نہیں۔ وہ گہرے پانی میں جانے کا خطرہ مول لینے کے بجائے کنارے پر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مبادا کہ اس سفر میں کوئی گزند پہنچ جائے یا کوئی مالی نقصان اٹھانا پڑ جائے۔ وہ لوگ بڑی چالاکی کے ساتھ اس قسم کے سب خطرات سے خود کو محفوظ فاصلے پر رکھ کر حق کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں‘ لیکن اس راستے میں ایسا طرزِ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ یہ تو سراسر قربانی کا راستہ ہے۔ اس راستے میں اپنی جان اور اپنے مال کو بچا بچا کر رکھنے والے فرزانوں کی نہیں بلکہ قدم قدم پر قربانیاں دینے والے دیوانوں کی ضرورت ہے۔ اسی فلسفے کو اقبالؔ نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے: ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے‘ ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

ایسے لوگوں کے مقابلے میں دوسری طرف کچھ وہ لوگ ہیں جو حق کو قبول کرتے ہی یہ نعرہ بلند کرتے ہوئے منجدھار میں کود پڑتے ہیں: ع ’’ہر چہ بادا باد‘ ما کشتی در آب انداختیم!‘‘ کہ اب جو ہو سو ہو‘ ہم تو حق کی اس کشتی میں سوار ہو کر اسے دریا میں ڈال چکے ہیں۔ اب یہ تیرے گی تو ہم بھی تیریں گے اور اگر اس راستے میں ہماری جان بھی چلی جائے تو ہم اس قربانی کے لیے بھی تیار ہیں۔

﴿فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ﴾ ’’تو اگر اُسے کوئی فائدہ پہنچے تو اس پر مطمئن رہتا ہے۔‘‘

﴿وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ﴾ ’’اور اگر اسے کوئی آزمائش آجائے تو اپنے مُنہ کے بل اُلٹا پھر جاتا ہے۔‘‘

ایسے لوگ موافق حالات میں تو ہر کام میں اہل ایمان کے ساتھ شریک رہتے ہیں‘ لیکن اگر کہیں اللہ کی راہ میں نکلنے کا مرحلہ آجائے یا کسی اور قربانی کا تقاضا ہو تو چپکے سے واپسی کی راہ لے لیتے ہیں۔

﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ﴾ ’’وہ خسارے میں رہا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔‘‘
﴿ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪﴾ ’’یہی تو کھلا خسارہ ہے۔‘‘

یہ بہت ہی نمایاں اور واضح تباہی ہے۔

اس آیت میں منافقانہ کردار کا ذکر ہے۔ اسی طرح اس سورت میں جہاد کا ذکر بھی ملتا ہے۔ منافقت اور جہاد چونکہ مدنی سورتوں کے موضوعات ہیں اس لیے سورۃ الحج کو بعض مفسرین مدنی سورت مانتے ہیں‘ لیکن میرے نزدیک یہ مکی ہے۔ تفسیر طبری میں منقول حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس سورت کی کچھ آیات (۳۸ تا ۴۱) اثنائے سفر ہجرت میں نازل ہوئیں۔ چنانچہ ان آیات کو ’’برزخی آیات‘‘ کہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ سورۃ الحج کو اس بنا پر بھی مدنی سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بعض آیات کی سورۃ البقرۃ کی بعض آیات کے ساتھ گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ اور سورۃ الحج کی آخری آیت میں ’’شہادت علی الناس‘‘ کا مضمون بالکل ایک جیسے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح زیر نظر آیت میں منافقین کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ اس کیفیت سے بہت مشابہت رکھتی ہے جس کا نقشہ سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں کھینچا گیا ہے کہ جب بجلی چمکتی ہے تو یہ لوگ کچھ چل پھر لیتے ہیں لیکن جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال مدینہ میں حضور ﷺ کے سامنے منافقین کا بالکل وہی حال تھا جس کی تصویر سورۃ البقرۃ کی مذکورہ تمثیل اور زیر مطالعہ آیت میں دکھائی گئی ہے۔ جب کسی جنگ یا کسی مہم کا تقاضا نہ ہوتا تو یہ لوگ حضور ﷺ کی محفل میں باقاعدگی سے حاضر ہوتے اور بڑے بڑے دعوے کرتے‘ مگر جونہی کسی قربانی کا مرحلہ آتا تو گویا اوندھے منہ گر پڑتے تھے۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں اس بیماری سے بچائے اور اقامت دین کی جدوجہد میں پورے خلوص کے ساتھ ہمہ تن اور ہمہ وجوہ اپنے آپ کو جھونک دینے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ (آمین یارب العالمین!)

آیت ۱۲ ﴿يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ﴾ ’’وہ پکارتا ہے اللہ کے سوا اُن کو جو نہ اسے کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نفع دے سکتے ہیں۔‘‘

﴿ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑫﴾ ’’یہی ہے بہت دور کی گمراہی۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ﴾ ’’وہ پکارتا ہے اس کو جس کا ضرر اس کے نفع سے قریب تر ہے۔‘‘

اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کو معبود کا درجہ دے کر پکارے گا تو اس سے اس کو کچھ نفع تو ملنے والا نہیں ہے' البتہ اس سے نقصان اسے بہر حال مل کر رہے گا۔

﴿لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ۝۱۳﴾ ''بہت ہی بُرا ہے وہ مددگار اور بہت ہی بُرا ہے وہ رفیق۔''

آیت ۱۴ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ﴾ ''یقیناً اللہ داخل کرے گا اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' اُن باغوں میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝۱۴﴾ ''یقیناً اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اُس کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔

آیت ۱۵ ﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ ''جس شخص کو یہ گمان ہو کہ اللہ ہرگز اس کی مدد نہیں کرے گا دنیا اور آخرت میں''

﴿فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ﴾ ''تو اسے چاہیے کہ وہ ایک رسّی آسمان کی طرف تانے' پھر اسے کاٹ دے''

﴿فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝۱۵﴾ ''پھر دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس چیز کو دور کر دیتی ہے جو اسے غصہ میں لاتی ہے!''

یہ آیت مشکلات القرآن میں سے ہے اور مختلف مفسرین نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تعبیر کی ہے۔ میرے نزدیک ''موضح القرآن'' میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی تعبیر سب سے بہتر ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو پورے اخلاص کے ساتھ ہمہ وقت دین کی خدمت میں مصروف ہے اور اس رستے میں آنے والی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اللہ سے مسلسل امید رکھتا ہے کہ آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں اللہ کی مدد ضرور آئے گی۔ لیکن خدانخواستہ کسی مرحلے پر اگر وہ اللہ کی مدد سے مایوس ہو جائے تو اس کی یہ کیفیت اس کے لیے ناکامی کا باعث بن جائے گی۔ چنانچہ اللہ کے راستے میں جدوجہد کرنے والوں کو ع ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کے مصداق کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور اللہ کی مدد سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ سورۃ الزمر کی آیت ۵۳ میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ﴾ کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ اگر کسی خوش قسمت انسان کو اللہ کے رستے میں جدوجہد کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے تو اسے اللہ کے اس حکم کی تعمیل بھی کرنی چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے فیصلے اس کی اپنی مشیت کے مطابق ہوتے ہیں اور اس کی مشیت میں بندوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ بندوں کو تو بس یہ چاہیے کہ وہ اپنے اپنے حصے کی کوشش کریں اور اس کے وعدوں پر پختہ یقین رکھیں۔ جیسے اس کے بہت سے وعدوں میں سے ایک خوش کن وعدہ یہ بھی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ﴾ (العنکبوت:۶۹) ''اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے' ہم لازماً انہیں اپنے راستے دکھائیں گے''۔ چنانچہ داعیانِ حق کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے اس کے حضور یوں التجا کرتے رہنا چاہیے: ﴿اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹﴾ (آل عمران) ''یقیناً تُو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا''۔ ہمیں یہ اندیشہ تو نہیں ہے کہ تو اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا' بلکہ ہمیں یہ فکر دامن گیر ہے کہ ہم تیرے وعدوں کا مصداق بننے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں۔ اس کے لیے جو شرائط مطلوب ہیں وہ شرائط ہم پوری کر بھی سکیں گے یا نہیں!

آیت زیر نظر میں یہ نکتہ سمجھانے کے لیے ایک شخص کی مثال دی گئی ہے جس نے اپنے اوپر ایک رسی (اللہ کی طرف سے امید) کو تھاما ہوا ہے۔ وہ شخص اگر کسی مرحلے پر مایوس ہو کر خود ہی رسی کو چھوڑ دے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ جیسے ایک حدیث میں قرآن کو اللہ کی رسی قرار دیا گیا ہے☆ ایسے ہی اللہ کی امید بھی ایک معنوی رسّی ہے جو ہمیں اللہ کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہے۔ جب تک یہ رسی ہمارے ہاتھ میں رہے گی اللہ سے ہمارا تعلق قائم رہے گا' اور ہمارے لیے ایک سہارا موجود رہے گا۔ اگر ہم اس رسّی کو کاٹ دیں گے یعنی اللہ سے اپنی اُمید منقطع کر لیں گے تو اس مضبوط سہارے کو گویا خود ہی اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیں گے۔ ایسا کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ ہم بے یار و مددگار ہو جائیں گے (زمین پر اوندھے منہ گر جائیں گے)۔ چنانچہ اس آیت کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی نصرت کی امید اور اس کے وعدوں پر یقین رکھو' یہ تمہارے لیے بہت مضبوط سہارا ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)) ''اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے۔'' (الجامع الصغیر للسیوطی' ح:۶۲۲۰۔ السلسلة الصحيحة للألبانی' ح:۲۰۲۴۔ راوی: ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ)

آیت ۱۶ ﴿وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝۱۶﴾ ''اور اسی طرح ہم نے نازل کیا ہے اس (قرآن) کو روشن نشانیوں کی شکل میں' اور یہ کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

اس کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہے کہ ''اللہ ہدایت دیتا ہے اُس کو جو (ہدایت حاصل کرنا) چاہتا ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو (محمد ﷺ پر) ایمان لائے ہیں اور جو یہودی' مجوسی اور عیسائی ہیں' اور جن لوگوں نے شرک کی روش اختیار کی ہے''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۱۷﴾ ''یقیناً اللہ فیصلہ کرے گا ان کے مابین قیامت کے دن۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔''

یعنی ہر چیز اور ہر انسان کے دل کی کیفیت اُس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ کے سامنے سربسجود ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں''

﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَاۗبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ﴾ ''اور سورج' چاند' ستارے' پہاڑ' درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بھی بہت سارے۔''

انسانوں کے علاوہ باقی تمام مخلوقات قانونِ خداوندی اور تکوینی نظام کے اصول وضوابط کی پابند اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں مصروفِ عمل ہیں' البتہ اس سلسلے میں انسانوں کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ سب کے سب ایک سے نہیں ہیں۔ انسانوں کو جو محدود آزادی ملی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر کچھ لوگ اللہ سے بغاوت کر دیتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسری چیزوں مثلاً سورج' چاند اور درختوں تک کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو ہدایت اور اپنی معرفت عطا فرماتا ہے وہ صرف اسی کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔

﴿وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ﴾ ''اور بہت سے (انسان) ایسے ہیں جو عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔''

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ﴾ ''اور جس کو اللہ ہی رسوا کر دے پھر اسے

عزت دینے والا کوئی نہیں۔''

اللہ نے تو انسان کو ''خلیفۃ اللّٰہ فی الارض'' کا مقام عطا کیا تھا' اسے مسجودِ ملائک بنایا تھا۔ اب اگر کوئی انسان اپنے آپ کو خود ہی اس مقامِ رفیع سے نیچے گرا دے اور مخلوق کے سامنے اپنا سر جھکا کر خود کو ذلیل ورسوا کر لے تو اسے تکریم انسانی کیونکر حاصل ہوگی!

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝۱۸﴾ ''یقیناً اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اس آیت کے اندر مختلف چیزوں کے تذکرے میں اوپر سے نیچے کی طرف ایک خوبصورت ترتیب وتدریج پائی جاتی ہے۔ سورج سب سے بڑا ہے' اس کے بعد چاند' اس کے بعد ستارے جو بظاہر چاند سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ پھر نیچے زمین پر پہاڑ سب سے بلند ہیں' پھر درخت' پھر چوپائے اور آخر پر انسان۔

آیت ۱۹ ﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ﴾ ''یہ دو گروہ ہیں جو اپنے رب کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں۔''

یہ سورت چونکہ رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی تھی' اس لیے ان گروہوں سے مکہ کے دو گروہ مراد ہیں۔ یعنی ایک مؤمنین کا گروہ جو حضور ﷺ پر ایمان لا چکا تھا اور دوسرا وہ گروہ جو اب تک آپ ﷺ کی مخالفت پر اڑا ہوا تھا۔ (قبل ازیں آیت ۱۱ کے ضمن میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ سورۃ الحج مکی سورت ہے' البتہ اس کی کچھ آیات ایسی ہیں جو سفرِ ہجرت کے دوران نازل ہوئیں تھیں۔)

﴿فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ﴾ ''تو جو لوگ انکار کر رہے ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں گے۔''

کپڑے کو قطع کرنے کا ذکر کر کے لباس تیار کرنے کے عمل کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ یعنی جس طرح درزی پہلے مطلوبہ ناپ کے مطابق کپڑے کو کاٹتا ہے اور پھر لباس تیار کرتا ہے اسی طرح منکرین حق کے لیے جہنم کی آگ سے لباس تیار کیے جائیں گے۔

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝۱۹﴾ ''ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی بہایا جائے گا۔''

آیت ۲۰ ﴿يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝۲۰﴾ ''اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں

کے اندر ہے سب گل جائے گا اور ان کی کھالیں بھی۔''

آیت ۲۱ ﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾﴾ ''اور ان (کی سرکوبی) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔''

آیت ۲۲ ﴿كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۠﴾ ''جب بھی وہ چاہیں گے کہ اس میں سے نکل جائیں غم کے مارے، تو انہیں اسی میں واپس لوٹا دیا جائے گا۔''

﴿وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾﴾ ''اور (ان سے کہا جائے گا کہ) چکھو اب مزہ اس جلانے والے عذاب کا۔''

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے انکار کی پاداش میں اب یہ عذاب ہمیشہ کے لیے تمہارا مقدر ہے۔ اب تم نے اسی میں رہنا ہے۔ منکرین کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب دوسرے گروہ یعنی اہل ایمان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''یقیناً اللہ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی''

﴿يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾﴾ ''پہنائے جائیں گے اس (جنت) میں انہیں سونے کے کنگن اور موتی، اور اس میں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔''

دنیا میں ریشم پہننا مَردوں کے لیے حرام ہے مگر جنتیوں کے لباس خصوصی طور پر ریشم سے تیار کیے جائیں گے۔ اوپر والا لباس باریک ریشم کا ہوگا جبکہ اس کے نیچے گاڑھے ریشم کا۔

آیت ۲۴ ﴿وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ﴾ ''اور ان کی راہنمائی کر دی گئی ہے بہترین بات کی طرف''

یہاں بہترین بات سے مراد کلمہ طیبہ: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہو سکتا ہے یا پھر یہ کلمہ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

﴿وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿٢٤﴾﴾ ''اور ان کی راہنمائی کر دی گئی ہے الحمید (اللہ) کی راہ کی طرف۔''

انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے کی ہدایت دی گئی ہے جو سب تعریفوں کے لائق ہے اور وہ اس راستے پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾﴾ (الواقعہ) کے اندر پہنچ جائیں گے۔

آیات ۲۵ تا ۳۳

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَاۗءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٥﴾ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۙ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ ۭ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿٣٠﴾ حُنَفَاۗءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿٣١﴾ ذٰلِكَ ۭ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿٣٢﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٣٣﴾

یہ دو رکوع مناسک حج کے بارے میں ہیں۔ سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں اور پچیسویں رکوع میں بھی مناسکِ حج کا تذکرہ ہے مگر وہاں پر قربانی کا ذکر نہیں ہوا۔ صرف قبل از وقت سر منڈوانے کی صورت میں کفارے کے طور پر جانور ذبح کرنے (دمِ جنایت) اور حج و عمرہ کو جمع کرنے (قِران یا تمتّع) کی صورت میں دمِ شکر کا تذکرہ ہے۔ لیکن یہاں قربانی اور طواف کا

خاص طور پر ذکر ہے۔

آیت ۲۵ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ 9

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ روکتے ہیں لوگوں کو اللہ کے راستے سے اور مسجدِ حرام سے''

کفار مکہ کی مخالفانہ سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جن کے باعث مسلمان نہ صرف جوارِ بیت اللہ کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے بلکہ ایک عرصے تک حج وعمرہ کی سعادت حاصل کرنے سے محروم بھی رہے۔

﴿الَّذِیْ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨالْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ ؕ﴾ ''جس کو ہم نے سب لوگوں کے لیے مساوی قرار دیا ہے' خواہ اس میں مقیم ہوں یا باہر سے آنے والے۔''

ان دونوں اقسام کے لوگوں کے لیے ''مقیم'' اور ''آفاقی'' کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ مقیم ہو یا آفاقی حرم کے اندر سب کے حقوق برابر ہیں' کسی کو کسی پر ترجیح یا برتری نہیں دی جاسکتی۔ اب بھی وہاں پر یہ مساوات برقرار ہے۔ باہر سے آنے والا کوئی شخص پہلی صف میں بیٹھا ہو تو اسے کوئی وہاں سے نہیں اٹھا سکتا۔ البتہ کوئی ناجائز طریقے سے اپنے لیے کوئی رعایت حاصل کر لے یا حکومتی سطح پر کسی کو وی آئی پی قرار دے کر دوسروں کے حقوق متأثر کیے جائیں تو یہ الگ بات ہے۔

﴿وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ﴾ ''اور جو کوئی ارادہ کرے اس میں کسی ٹیڑھی راہ کا ظلم کے ساتھ''

بیت اللہ کے اندر جو کوئی اپنی شرارتِ نفس کی بنا پر یا ظلم و ناانصافی کی روش پر چلتے ہوئے کسی بے دینی کے ارتکاب' کوئی کجی پیدا کرنے یا لوگوں کو سیدھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا:

﴿نُذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴿۲۵﴾﴾ ''اسے ہم مزہ چکھائیں گے دردناک عذاب کا۔''

آیت ۲۶ ﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰہِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ﴾ ''اور جب ہم نے معیّن کر دی ابراہیمؑ کے لیے اپنے اس گھر کی جگہ''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نشاندہی کر دی گئی کہ ٹھیک اس جگہ پر بیت اللہ کی تعمیر کی جائے۔ غالباً یہ وہی جگہ تھی جہاں حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔ بعد میں سیلاب کی

وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر شدہ دیواریں گر گئیں اور ان کے آثار بھی ناپید ہو گئے لیکن زمین کے اندر بنیادیں موجود تھیں۔

﴿اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْـًٔا وَّطَہِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ﴿۲۶﴾﴾ ''(اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا' اور میرے اِس گھر کو پاک رکھنا طواف کرنے والوں کے لیے اور قیام' رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔''

یہی مضمون سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں بھی آچکا ہے: ﴿وَعَہِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰہٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَہِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ﴿۱۲۵﴾﴾ ''اور عہد لیا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) سے کہ پاک رکھیں میرے گھر کو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے''۔ دونوں آیات کے الفاظ بھی ملتے جلتے ہیں' صرف یہ فرق ہے کہ سورۃ البقرۃ میں لفظ ''العٰکِفِیْن'' آیا ہے اور آیت زیر نظر میں اس کی جگہ ''القَائِمِیْن'' استعمال ہوا ہے۔

آیت ۲۷ ﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ ''اور لوگوں میں حج کی منادی کر دو''

اس حکم کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسے اعلان کیا ہوگا' کس طرح لوگوں کو پکارا ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس پیغام اور پکار کو کہاں کہاں تک پہنچایا ہوگا' یہ معاملہ اللہ اور ان کے درمیان ہے۔

﴿یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ﴿۲۷﴾﴾ ''آئیں گے آپؑ کے پاس لوگ پیدل بھی اور بڑی لاغر اونٹنیوں پر بھی' جو پہنچیں گی دور دراز گہری وادیوں میں سے ہو کر۔''

پہاڑوں کے درمیان کے راستہ کو ''فَجّ'' کہتے ہیں۔ اس سے مکہ کی مضافاتی وادیوں اور گھاٹیوں کی طرف اشارہ ہے کہ آپؑ کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے دور و نزدیک سے لوگ آئیں گے۔ ان میں پیدل بھی ہوں گے اور سوار بھی۔ وہ دور و نزدیک کے گہرے پہاڑی راستوں کو عبور کرتے ہوئے یہاں پہنچیں گے۔ لاغر اونٹنیوں کے ذکر سے دور دراز کے سفر مراد ہیں کہ طویل سفر کی وجہ سے ان کی اونٹنیاں لاغر ہو چکی ہوں گی۔

آیت ۲۸ ﴿لِّیَشْہَدُوْا مَنَافِعَ لَہُمْ﴾ ''تاکہ وہ حاضر ہوں اپنی منفعت کی جگہوں پر''

﴿وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَہُمْ مِّنْۢ بَہِیْمَۃِ

الْاَنْعَامِ ۚ﴾ ’’اور اللہ کا نام لیں معیّن دنوں میں ان مویشیوں پر جو اُس نے انہیں عطا کیے ہیں۔‘‘

’’اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ‘‘ سے مراد قربانی (۱۰‘۱۱ اور ۱۲ ذوالحجہ) کے دن ہیں۔ یعنی ایامِ نحر میں وہ لوگ اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کریں۔

﴿فَکُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ﴿۲۸﴾﴾ ’’تو اس میں سے خود بھی کھاؤ اور خستہ حال محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ﴾ ’’پھر چاہیے کہ وہ دور کریں اپنے میل کچیل‘‘

اس سے احرام کھول کر نہانا دھونا مراد ہے۔ حج کرنے والوں کے لیے ۱۰ ذوالحجہ کے دن چار افعال ضروری ہیں‘ یعنی رمی‘ نحر‘ حلق اور طواف۔ نحر اور حلق کے بعد احرام کھولو‘ پھر نہا دھو کر صاف لباس پہنو اور طوافِ زیارت کے لیے جاؤ۔

﴿وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴿۲۹﴾﴾ ’’اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ﴾ ’’یہ سن چکے! اور جو کوئی تعظیم کرے اللہ کی حرمتوں کی تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اس کے رب کے نزدیک۔‘‘

اللہ نے جس جس چیز کو محترم ٹھہرایا ہے وہ سب ’’حرمات اللہ‘‘ ہیں۔ اس میں خود بیت اللہ اور حرمت والے مہینے بھی شامل ہیں۔ پھر جیسا کہ سورۃ المائدۃ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قربانی کے جانور جن کی گردنوں میں قلادے ڈالے گئے ہوں وہ بھی اور خود عازمینِ حج ﴿آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ﴾ (آیت ۲) بھی محترم ہیں۔ یہ سب حرمات اللہ ہیں اور ان سب کی تعظیم لازمی ہے۔

﴿وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ﴾ ’’اور حلال کر دیے گئے تمہارے لیے تمام چوپائے سوائے اس کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیا گیا ہے‘‘

یعنی خنزیر کے بارے میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ وہ حرام ہے۔ باقی بکری‘ بھیڑ‘ گائے‘ اونٹ وغیرہ کی قربانی دی جا سکتی ہے۔

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾﴾ ’’تو تم بچو بتوں کی گندگی سے اور بچو جھوٹ بات سے۔‘‘

یعنی شرک سے بچنا تمہاری پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ مکہ میں اس وقت بُت پرستی عام تھی جو

شرک کی بدترین شکل ہے۔

آیت ۳۱ ﴿حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ بِهٖ ۭ﴾ ’’یکسو ہو جاؤ اللہ کے لیے‘ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے۔‘‘

اللہ کی بندگی میں کسی اعتبار اور کسی پہلو سے شرک کا شائبہ تک نہ آنے پائے۔ نہ ذات میں‘ نہ صفات میں‘ نہ حقوق میں‘ نہ اختیارات میں۔

﴿وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ﴾ ’’اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو وہ ایسے ہے جیسے آسمان سے گر پڑا‘‘

شرک کرنے والے انسان کی مثال ایسے ہے جیسے وہ کسی بلندی پر رسّی کی مدد سے لٹکا ہوا تھا تو اس کی رسّی کٹ گئی اور وہ یکدم تیزی سے نیچے آ رہا ہے۔

﴿فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ ﴿۳۱﴾﴾ ’’تو اسے پرندے اُچک لیں یا ہوا اُڑا پھینکے کسی دور دراز جگہ پر۔‘‘

تو ایسے شخص کی اب کیفیت یہ ہے یا تو وہ باز اور عقاب جیسے شکاری پرندوں کے رحم و کرم پر ہوگا یا پھر تیز ہوا کا کوئی جھونکا اسے کسی کھائی میں پٹخ دے گا۔ مشرک کا ایسا انجام اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ کا دامن چھوڑ کر وہ بے سہارا ہو جاتا ہے‘ جبکہ توحید پرست شخص ایک مضبوط سہارے پر قائم ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی آیت ۲۷ میں فرمایا گیا ہے: ﴿یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ ’’ثابت قدم رکھتا ہے اللہ اہلِ ایمان کو قولِ ثابت (کلمہ توحید) کے ساتھ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾﴾ ’’یہ سب کچھ (تم نے سن لیا)‘ اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا تو یقیناً یہ دلوں کے تقویٰ کی بات ہے۔‘‘

شعائر کی واحد ’’شعیرہ‘‘ ہے۔ لغوی اعتبار سے اس لفظ کا تعلق ’’شعور‘‘ سے ہے۔ اس مفہوم میں ہر وہ چیز ’’شعائر اللہ‘‘ میں سے ہے جس کے حوالے سے اللہ کی ذات‘ اس کی صفات اور اس کی بندگی کا شعور انسان کے دل میں پیدا ہو۔ اسی حوالے سے سورۃ البقرۃ میں صفا اور مروہ کو بھی شعائر اللہ کہا گیا ہے: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۱۵۸)۔ چنانچہ خود بیت اللہ‘ مقامِ ابراہیم‘ صفا اور مروہ سب شعائر اللہ میں شامل ہیں۔

(باقی صفحہ 44 پر)

اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت

اور اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۱۳ جون ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (الحجرات:۱۳)

﴿وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾ (البقرۃ)

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ سَعْدِ بْنِ سِنَانِ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ :

((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ)) (۱)

سیدنا ابوسعید سعد بن سنان خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ خود نقصان اٹھاؤ!''

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا ' اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ :

((لَوْ یُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاھُمْ ' لَادَّعٰی رِجَالٌ اَمْوَالَ قَوْمٍ وَّدِمَاءَ ھُمْ' وَلٰکِنَّ الْبَیِّنَةَ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ)) (۲)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) حدیث حسن رواہ ابن ماجة والدارقطنی وغیرھما مسندا' ورواہ مالك فی المؤطا عن عمرو بن یحیی عن ابیه عن النبی ﷺ مُرْسَلًا فاسقط اباسعید' وله طرق یقوی بعضها ببعض

(۲) حدیث حسن' رواہ البیهقی وغیره هکذا' وبعضه فی الصحیحین

''اگر لوگوں کو ان کے دعویٰ کے مطابق (بلاتحقیق) دے دیا جائے تو لوگ دوسروں کے اموال اور خون پر دعویٰ کرنے لگیں' لہٰذا اصول یہ ہے کہ مدعی ثبوت پیش کرے اور مدعا علیہ اگر انکاری ہو تو قسم اٹھائے۔''

معزز سامعین کرام!

اربعین نووی کی احادیث کا سلسلہ وار مطالعہ جاری ہے اور آج ہم حدیث ۳۲ اور ۳۳ کا مطالعہ کریں گے ـــــ احادیث کے مطالعہ سے پہلے جان لیجیے کہ اس مجموعہ احادیث کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اس میں دین اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ احادیث میں صرف ۴۲ احادیث ہیں' لیکن دین اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس میں بیان ہونے سے رہ گیا ہو۔ دین کی اصل روح کیا ہے' دین کا اصل ڈھانچہ کیا ہے' دین کا پورا نقشہ درخت یا عمارت کی صورت میں کیا ہے' اخلاقیات کے کیا اصول ہیں' شریعت کی بنیاد کیا ہے' حلال اور حرام کے مابین مشتبہات کے بارے میں کیا رویہ ہونا چاہیے وغیرہ' یہ سب اس مجموعہ میں موجود ہے۔

آج ہمارے زیر مطالعہ دو احادیث ہیں جو نظامِ عدل سے متعلق ہیں۔ اصل میں لفظ عدل مختلف سطحوں پر مختلف معنی رکھتا ہے۔ ایک ہے عدلِ اجتماعی کہ سیاسی نظام ایسا نہیں ہونا چاہیے جس میں کسی خاص خاندان یا خاص طبقے کی رعایت ملحوظ ہو بلکہ وہ تمام عوام کے لیے بہترین ہونا چاہیے۔ ہر ایک کو اظہارِ رائے کی بھی آزادی ہو اور جماعت بنانے کی بھی۔ یہ نہ ہو کہ ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا ہوا ہے یا ایک خاندان اختیارات پر قابض ہے یا کوئی ایک خاص طبقہ باقی لوگوں پر حکمرانی کر رہا ہے۔ یہ سب اجتماعی اور سیاسی سطح پر ظلم ہے جس کی تلافی بہرصورت ہونی چاہیے اور اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

معاشی سطح پر عدل

معاشی سطح پر عدل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بھی دنیا میں پیدا کی ہیں' ان سب کی تقسیم منصفانہ ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ ان میں کسی خاص گروہ کی اجارہ داری قائم

ہو جائے اور دوسرا گروہ ان کا دست نگر بن کر رہ جائے بایں طور کہ ایک طرف دولت کے انبار لگ جائیں اور ایک طرف فقر و فاقہ اور بھوک کا عالم ہو‘ بلکہ ہر انسان تک بنیادی ضروریات کی فراہمی ہونی چاہیے۔ اسلام کے نظامِ عدل میں عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوگی‘ باقی ہر شخص کو آزاد چھوڑا جائے گا کہ وہ محنت ومشقت کرے‘ جِدّوجُہد کرے اور حلال ذریعے سے کمائے۔ اب اس صورت میں اگر کوئی زیادہ کمائے تو وہ اس کا حق ہے اور کوئی کم کمائے تو یہ اس کا اپنا انفرادی معاملہ ہے۔ البتہ جو پیچھے رہ جائیں تو اسلام میں ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی بھی ایک صورت رکھی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس اُن کی ضرورت سے زائد ہو گیا ہے اور وہ ایک خاص سطح (جسے فقہی اصطلاح میں ’’نصاب‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے) سے آگے نکل گئے ہیں تو ان سے زکوٰۃ لی جائے اور ان طبقات کو پہنچائی جائے جو پیچھے رہ گئے ہیں۔

سوشل سکیورٹی کا نظام اسلام کا ایجاد کردہ ہے!

آج کی دنیا میں اسے سوشل سکیورٹی کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ موجودہ دور میں انسان نے بہت ترقی کی ہے‘ لیکن سوشل سکیورٹی کا اصول موجودہ دور کا ایجاد کردہ نہیں ہے‘ بلکہ اس کا آغاز خلافت راشدہ کے دور سے ہوا تھا۔ خلافت راشدہ کے دور میں یہ اصول رائج تھا کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کرنا خلافت کی ذمہ داری ہے‘ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ اگر دجلہ یا فرات کے کنارے (یعنی مدینہ منورہ سے کوسوں دور عراق کے ملک میں) کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

سوشل سکیورٹی کا تصور اگرچہ اسلام نے دیا تھا‘ لیکن آج ہم اس حوالے سے بہت پیچھے ہیں۔ ہمارا نظام ظالمانہ ہے‘ یہاں غریب پستی کی حدوں کو چھوتے ہوئے غریب تر اور امیر ترقی کے زینے چڑھتے ہوئے امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک طرف ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی ہے جہاں ایک خالی پلاٹ بھی کروڑوں کا ہے۔ وہاں اونچے اونچے محلات بن رہے ہیں اور ان پر ایسے انداز سے ماربل تھوپا جا رہا ہے جیسے کسی زمانے میں

دیہات میں عورتیں دیواروں پر اوپلے تھوپ دیتی تھیں‘ جبکہ ایک طرف غریبوں کی جھگیاں ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں ہے اور انہیں بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں ہیں۔ یہ معاشی سطح پر ظلم ہے اور اسلام کے نظامِ عدل میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ہمارے ہاں سوشل سکیورٹی کا نام تک نہیں ہے‘ حالانکہ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم سوشل سکیورٹی کے تصور کو آگے لے کر چلتے۔ ہم نے تو اسے اختیار نہیں کیا‘ جبکہ دنیا نے اس کو اختیار کر کے انتہا تک پہنچا کر دکھایا ہے۔ سیکنڈے نیوین ممالک یعنی ناروے‘ سویڈن اور ڈنمارک میں سوشل سکیورٹی کا اعلیٰ ترین نظام موجود ہے۔ باقی فحاشی‘ عریانی اور سیکس کے حوالے سے وہاں بدترین معاملہ ہے اور اس حوالے سے وہ معاشرہ سنڈاس بن چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے‘ لیکن روٹی تو ہر ایک کو ملے گی۔ ملکہ کا بیٹا جہاں پڑھے گا وہیں ایک فقیر کا بیٹا بھی پڑھے گا۔ وہاں پر کوئی دو نظامِ تعلیم نہیں ہیں‘ جیسے ہمارے ہاں ہے کہ غریب کے بچوں کے لیے چٹائیوں والے سکول ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر بچے پڑھتے ہیں‘ جبکہ دوسری طرف AC اور دنیا کی تمام نعمتوں سے مالا مال پرائیویٹ سکول ہیں جن میں پندرہ پندرہ‘ بیس بیس ہزار فیس دے کر اُمراء کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں‘ جبکہ وہاں امیر اور غریب کے بچے ایک ہی سکول میں پڑھتے ہیں۔ اسی طرح جس ہسپتال کے اندر ملکہ کا علاج ہوگا اسی ہسپتال میں غریب ترین آدمی کا بھی علاج ہوگا۔ صرف ایک بات میں نے وہاں دیکھی کہ ملکہ کے لیے ہسپتال میں ایک کمرہ reserve ہوتا ہے تاکہ اگر کسی وقت ملکہ کو ضرورت پڑ جائے اور ہسپتال میں جگہ نہ ہو تو بس وہ ایک کمرہ ملکہ کے لیے مختص رہے گا۔ باقی علاج وہی ہوگا جو ایک غریب کا ہوتا ہے۔ کوئی مزدور دورانِ مزدوری معذور ہو گیا ہے تو ساری عمر اس کو پینشن ملے گی۔ آپ اپنے آپ کو معذور ڈکلیئر کرا لیں تو اس کے بعد آپ عیش کریں۔ ہمارے جو لوگ وہاں پر گئے ہیں‘ انہوں نے غلط طور پر اس کا فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طریقے اور بہانے سے اپنے آپ کو ان فٹ قرار دلوا لیتے ہیں اور پھر یہاں آ کر عیش کرتے ہیں۔ ان کی پنشن یہاں آ رہی ہوتی ہے اور پاکستان کے ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ اتنی نہیں ہے جتنی ان کی پنشن ہوتی ہے۔

بہرحال انہوں نے یہ کام کر کے دکھایا ہے اور جس طریقے سے وہاں علاج معالجہ کا معاملہ ہے‘ ایسا امریکہ میں بھی نہیں ہے۔ امریکہ اس اعتبار سے برا ملک ہے اور وہاں ہیلتھ کیئر اس سطح کی نہیں ہے۔ وہاں آپ کو علاج بہت مہنگے داموں خریدنا پڑتا ہے۔ پھر اس کے لیے انہوں نے ہیلتھ انشورنس کا نظام بنایا ہے۔ آپ ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے پیسے کٹواتے رہتے ہیں اور جب آپ بیمار ہوں تو انشورنس کمپنی آپ کو آپ کے علاج کے لیے پیسے دے گی۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں بھی آپ نے انشورنس کے پیسے دیے تھے‘ تب ہی آپ کو یہ حق حاصل ہوا ہے‘ لیکن آپ انگلینڈ میں چلے جائیے تو علاج مکمل طور پر فری ہے اور برابری کی سطح پر ہے‘ یعنی امیر اور غریب کا کوئی فرق وہاں روا نہیں رکھا جاتا۔ ہمارے ایک بزرگ ہوا کرتے تھے سراج الحق سید صاحب‘ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے‘ میں ایک دفعہ ان کے ساتھ برطانیہ گیا تھا۔ ان کے ایک بھائی بہت عرصے سے وہاں مقیم تھے اور ذیابیطس کے بہت پرانے مریض تھے‘ لیکن ان کا جس عمدہ طریقے سے وہاں پر علاج ہوتا تھا‘ اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر ہفتے ایک شخص گھر پر آ کر ان کے پاؤں کے ناخن تراشتا تھا۔ وہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ اگر اس نے خود ناخن کاٹا اور ذرا سا زخم لگ گیا تو پھر ذیابیطس کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر زہر پھیل جائے اور انگوٹھا کاٹنا پڑے۔ کیا آپ اس چیز کا اپنے معاشرے میں تصور کر سکتے ہیں؟

معاشرتی اور سماجی سطح پر عدل

سماجی سطح پر عدل انسانوں کے مابین مساوات ہے کہ انسانوں میں بحیثیت انسان کوئی اونچ نیچ نہیں ہے اور پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ چاہے وہ گورے ہوں‘ کالے ہوں‘ سید ہوں‘ مصلّی ہوں‘ یا کسی اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں‘ وہ سب برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عورت اور مرد بھی بحیثیت انسان برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے‘ البتہ انتظامی سطح پر عورت اور مرد میں فرق ہے۔ گھر کے ادارے کا سربراہ ایک ہی ہوسکتا ہے‘ دو نہیں ہو سکتے۔ جیسے آپ کوئی انجمن بناتے ہیں تو صدر ایک ہی ہوگا‘ البتہ نائب صدور چار پانچ یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں‘ اس سے فرق نہیں

پڑتا۔ اسی طرح آپ نے کاروبار کے لیے کوئی لمیٹڈ کمپنی بنائی ہے تو اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر ایک ہی ہوگا‘ جبکہ ڈائریکٹرز زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح گھر کے ادارے (institution of family) کا سربراہ ایک ہی ہے اور وہ مرد ہے‘ نہ کہ عورت۔ عورت کی حیثیت وزیر کی ہے‘ لیکن گھر میں اصل حکم مرد کا چلے گا اور وہ بھی اللہ اور رسول ﷺ کے دائرے کے اندر رہ کر‘ یہ نہیں کہ وہ فرعون بن جائے کہ جو چاہوں میں حکم دے سکتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اور اگر شوہر شریعت کے خلاف کوئی حکم دے گا تو بیوی ماننے کی پابند نہیں ہے۔ چنانچہ سماجی سطح پر عدل یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں‘ البتہ اگر کوئی فرقِ مراتب ہوگا تو وہ صرف اکتسابی (acquired) چیزوں میں ہوگا۔ مثلاً کسی نے کوئی اونچا مقام حاصل کر لیا ہے یا کوئی بہت بڑا خادمِ خلق بن گیا ہے تو اس کی زیادہ عزت کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی زیادہ متقی ہے تو اللہ کی نگاہ میں اس کی زیادہ قدر و منزلت ہوگی۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ﴾ (الحجرات:۱۳)

’’اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے اور ہم نے تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے ہاں وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہے۔‘‘

عدالتی سطح پر عدل

یہ تو اجتماعی سطح پر عدل ہے‘ جبکہ ایک ہے عدالتی نظام۔ بعض لوگوں میں جھگڑے ہو جاتے ہیں یا ایک دوسرے پر ظلم کر بیٹھتے ہیں —— ظلم کے حوالے سے وہ حدیث ہم پڑھ چکے ہیں: ((يَا عِبَادِيْ! اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ ، وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُّحَرَّمًا ، فَلَا تَظَالَمُوْا)) ’’میرے بندو! میں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے کہ کسی پر ظلم کروں اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے‘ لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم

نہ کرو‘‘ —— معاشرے میں جب ظلم وزیادتی ہوتی ہے تو پھر جھگڑے ہوتے ہیں۔ایک کہتا ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا میرا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ میرا ہے۔اس طرح ایک مدعی بن کے کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک مدعا علیہ بن کر۔اسی طریقے سے جرائم ہیں‘ جن کے مرتکبین کو سزا ملنی چاہیے۔اب عدالت کا کام ہے کہ اچھی طرح واقعہ کی چھان بین کرے کہ اس شخص نے جرم کیا ہے یا نہیں؟ اس کے لیے ظاہر بات ہے کہ عدالتی نظام ہوگا‘ گواہی کا معاملہ ہوگا اور مختلف طریقوں سے اس کا ثبوت فراہم کیا جائے گا۔یہ وہ عدل ہے جو عدالت کی سطح پر ہوتا ہے‘ جسے عدل وانصاف کی فراہمی کہتے ہیں۔

عدالتی نظام کے اصول وضوابط کے حوالے سے امام نووی دو بہت پیاری احادیث لائے ہیں۔پہلی حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے‘ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ)) یعنی نہ کوئی ظلم کرو اور نہ کسی قسم کا ظلم برداشت کرو۔یہ ایک سنہرا اصول ہے‘ نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ خود نقصان اٹھاؤ!

قصاص میں زندگی ہے!

زیر مطالعہ حدیث میں بیان کی گئی دوسری بات بظاہر بڑی عجیب لگتی ہے۔عام طور پر اخلاقی تعلیمات میں یہ تو کہا جاتا ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرو‘ لیکن یہ دوسرا پہلو نہیں بیان کیا جاتا کہ اللہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تم اپنے اوپر بھی کسی قسم کا ظلم برداشت نہ کرو۔اپنے حق کے لیے پوری جدوجہد کرو اور پھر بھی بات نہ بنے تو اپنے حق کے لیے جھگڑو‘ کیونکہ اگر تم ڈھیلے پڑ گئے تو ظالم کی ہمت افزائی ہو جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹)

’’اے ہوش مندو! تمہارے لیے قصاص میں (یعنی بدلہ لینے میں) زندگی ہے۔‘‘

عام طور پر اخلاقی تعلیمات میں کہا جاتا ہے کہ معاف کر دیا کرو۔قرآن بھی کہتا ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التغابن) ’’اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا‘ نہایت مہربان ہے‘‘۔اگر تم اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہو تو انسانوں کی زیادتیوں

کو بھی معاف کیا کرو۔تو یہ ہے اخلاقی سطح پر تعلیم‘ لیکن قانونی سطح پر یہ بھی تعلیم ہے کہ تمہارے لیے بدلہ لینے میں زندگی ہے۔

یہ توازن آپ کو صرف آسمانی ہدایات میں مل سکتا ہے۔عام انسان یا تو اِدھر انتہا کو نکل جائیں گے یا اُدھر انتہا کو نکل جائیں گے۔آپ پر کسی نے ظلم کیا ہے‘ زیادتی کی ہے‘ آپ کو کسی نے تھپڑ مار دیا ہے۔اگر تو آپ میں جوابی تھپڑ رسید کرنے کی ہمت نہیں تو پھر صبر کے سوا آپ کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے‘ لہٰذا ’’قہر درویش بر جانِ درویش‘‘ کے مصداق صبر کرو —— اور اگر آپ میں طاقت ہے تو آپ کے سامنے دو راستے ہیں‘ یا تو آپ معاف کر دیں یا بدلہ لے لیں۔معاف کرتے وقت بھی انسان کو دیکھنا چاہیے کہ آیا معاف کرنے میں مصلحت زیادہ ہے یا بدلہ لینے میں۔اس حوالے سے ہر کیس کا معاملہ علیحدہ ہو جائے گا۔اگر کسی شریف انسان نے اتفاقاً کوئی غلطی کر دی ہے تو معاف کر دینے میں فائدہ ہے‘ لیکن اگر کسی عادی مجرم نے ایسا کیا ہے‘ مثلاً کسی نے اپنی دھونس جمانے کے لیے جان بوجھ کر زیادتی کی ہے تو اس صورت میں اگر بدلہ نہیں لو گے تو اس کی ہمت افزائی ہو گی۔اس نے آج تمہیں تھپڑ مارا ہے تو کل کسی اور کو مارے گا۔لہٰذا Nip the evil in the bud کے مطابق اس کے تھپڑ کے جواب میں آپ بھی اس کو ایک تھپڑ رسید کریں تاکہ اس کی عقل ٹھکانے آ جائے اور کل کلاں وہ کسی اور کو تھپڑ مارنے کی جرأت نہ کر سکے۔

معاشرے کی اصلاح کے لیے سزاؤں کا نفاذ

آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیوں کے ہاں جو تبلیغ ہے وہ نظری تبلیغ ہے‘ اور اس پر عمل درآمد اس دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو تم بایاں گال بھی پیش کر دو۔پھر یہ کہ کوئی نالش کر کے تم سے تمہارا جُبّہ لینا چاہے تو جُبّہ کے ساتھ اپنا کُرتا بھی اُتار کر اس کو دے دو۔یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تعلیم ہے —— لیکن اس میں عدم توازن ہے۔عدم توازن کیوں ہے؟ یہ بھی سمجھ لیجیے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں‘ وہ معاذ اللہ کوئی غلط بات تو

نہیں کہہ سکتے! اصل میں نبی کی دعوت میں ایک خاص دور ہوتا ہے جب دعوت وتحریک کا تقاضا اور مصلحت اس میں ہوتی ہے کہ ظلم وزیادتی کو جھیلو‘ برداشت کرو اور جوابی کارروائی مت کرو۔ بارہ برس تک مکہ مکرمہ میں حضورﷺ کا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہی حکم تھا کہ کفارِ مکہ تمہیں ماریں تو برداشت کرو‘ تمہیں گالیاں دیں تو جوابی گالی مت دو‘ پتھر ماریں تو تم پھول پیش کرو۔ لیکن یہ اس دعوت وتحریک کی ایک مصلحت تھی‘ قانون نہیں تھا۔ قانون تو مدینہ منورہ میں آ کر اترا ہے کہ اگر تمہارے اوپر کسی نے زیادتی کی ہے تو اسی کے برابر اس سے بدلہ لو! یہ معاشرے کی اصلاح کے لیے بہت ضروری ہے۔ حدود اللہ اور سزاؤں کا نفاذ بھی اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ حدود اللہ کا نفاذ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ کو مجرم سے دشمنی ہو جاتی ہے‘ بلکہ کسی شخص نے چوری کی ہے تو اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم اس لیے ہے تاکہ لوگوں کو ہوش جائے اور پھر کوئی چوری نہ کرے۔

یہ معاملہ ہم بہت عرصے سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ سعودی عرب میں جرائم کی شرح بہت ہی کم ہے‘ کوئی چوری نہیں‘ کوئی ڈاکہ نہیں‘ اس لیے کہ وہاں چوروں کے ہاتھ کٹتے ہیں‘ ڈاکوؤں کو شرعی سزا ملتی ہے‘ قاتل کی گردن اڑائی جاتی ہے۔ جمعہ کے روز ریاض کی جامع مسجد کے باہر میدانِ عدل میں جلاد سب کے سامنے قاتل کی گردن اڑا دیتا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے تاکہ لوگوں کو ہوش آ جائے اور آئندہ پھر کوئی اس جرم کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی معاشرے کے اندر جرم نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر ہم نے یہی معجزہ اپنے پڑوسی اور برادر ملک افغانستان میں اُس وقت دیکھا جب طالبان نے وہاں اسلامی شریعت اور اسلامی سزاؤں کو نافذ کیا۔ طالبان کو موقع ہی نہیں دیا گیا کہ وہاں اسلامی نظام آگے بڑھتا اور اس کی برکات کا ظہور پورے طور پر ہوتا جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا تھا۔ حضور اکرمﷺ کے دور میں تو جہاد اور قتال کا مرحلہ جاری رہا‘ اس لیے اس نظام کی برکات ابھی پورے طور پر ظاہر نہیں ہو رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اسلامی انقلاب کے خلاف مزاحمتی اور انسدادی تحریکیں (counter-revolutionary movements)

اُٹھیں اور ان کو دبانے میں ساری توجہ صرف ہوئی۔ لیکن پھر جب عرب کے اندر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں امن قائم ہوا‘ حکومت مستحکم ہو گئی اور حکومتی رٹ مکمل طور پر نافذ ہو گئی تو پھر اسلام کی برکات کا مکمل طور پر ظہور ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ افغانستان میں ابھی صرف چند شرعی سزائیں نافذ کی گئی تھیں کہ چوری اور ڈاکے جیسے جرائم یکسر ختم ہو گئے۔ ہمارے ہاں کہہ دیتے ہیں کہ اگر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا تو آدھا ملک ہاتھ کٹوں کا ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں‘ یہ غلط پروپیگنڈا ہے۔ اس وقت واقعتاً حال یہی ہے کہ خیانت‘ چوری‘ دھوکہ دینا‘ ڈاکے ڈالنا یہ سب ہو رہا ہے‘ لیکن اگر شرعی سزائیں نافذ ہو جائیں تو چند ہاتھ کٹیں گے اور بعد میں جرم ختم ہو جائے گا۔ ورنہ امریکہ جیسے ملک میں‘ جہاں تعلیم انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور وہ اپنے آپ کو مہذب ترین سمجھتے ہیں‘ وہاں بھی انتہائی گھناؤنے جرم ہو رہے ہیں۔ کسی بھی معاشرے سے جرم کو دیس نکالا نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ناممکن ہے‘ بلکہ جرم تو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسلام میں سزاؤں کا سارا نظام معاشرے کی مصلحت کے لیے ہے۔ اگر ایک شادی شدہ شخص نے زنا کیا ہے تو اسے رجم کیجیے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے بعد زنا کا معاملہ بہت مشکل ہو جائے گا اور معاشرے میں خود بخود بہتری آ جائے گی۔ اسی لیے یہ تعلیم دی گئی کہ معاف کرنا اپنی جگہ بہتر ہے‘ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کی اصلاح اور بہتری کے لیے قصاص میں‘ بدلے میں‘ سزا دینے میں زندگی ہے۔ اس کو ایسے سمجھیں کہ جیسے کسی کے ہاتھ میں گنگرین ہو گیا‘ ہاتھ جل گیا‘ سڑ گیا تو پورا بازو کاٹ دیتے ہیں۔ بازو جسم کا حصہ ہے‘ لیکن پورے جسم کو بچانے کے لیے بازو کو کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے‘ ورنہ جسم میں زہر پھیل جائے گا اور موت واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک مجرم کی وجہ سے پورے معاشرے میں گند پھیل سکتا ہے‘ لہٰذا شادی شدہ زانی کو اگر آپ نے رجم کیا ہے یا قاتل کو جواباً قتل کیا ہے یا چور کا ہاتھ کاٹا ہے تو اس سے پورا معاشرہ ٹھیک رہے گا۔

الغرض زیر مطالعہ روایت میں یہ اصول دے دیا گیا کہ نہ کوئی ضرر پہنچاؤ اور نہ کوئی ضرر برداشت کرو۔ اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرو اور اگر کوئی ظلم اور

زیادتی ہوئی ہے تو پھر اس کے لیے قصاص لو۔ یہ نہ ہو کہ آپ ہر بار اخلاقی تعلیم کے باعث ہمیشہ درگزر سے ہی کام لیں اور قصاص کو سرے سے ہی چھوڑ دیں۔ انفرادی معاملات میں معافی اور درگزر والا معاملہ بھی ہوسکتا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ ایک آدمی نے آپ کے خلاف کوئی اقدام کیا ہے' لیکن اسے خود ہوش آ جائے گا' اسے خود احساس ہو جائے گا کہ میں نے زیادتی کی ہے تو ٹھیک ہے آپ اسے معاف کر دیں' لیکن اصول یہ نہیں ہے۔ اصول یہ ہے کہ آپ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگائیں' دلائل دیں' اس کے لیے ثبوت پیش کریں۔ اس سے معاشرہ صحیح سطح پر برقرار رہے گا اور درحقیقت اسی سے معاشرے کے اندر صحت مند روایات پروان چڑھیں گی۔

وکالت جھوٹ پر مبنی ہو تو حرام ہے!

عدالتی نظام میں ایک معاملہ وکالت کا ہوتا ہے۔ اگر وکالت میں جھوٹ نہ بولا جائے تو یہ پیشہ جائز ہے' لیکن ہمارے ہاں اس کے لوازم ہی یہ ہیں کہ جھوٹ بولو' جھوٹ بلواؤ اور خلافِ واقعہ بیان دلواؤ۔ یہ حرام ہے۔ فرض کیجیے مجھ سے کوئی خطا ہوگئی ہے اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرے ملکی قانون یا اسلامی شریعت میں میرے لیے کیا کیا رعایات ہیں۔ چنانچہ میں ایک وکیل کرتا ہوں اور وہ وکیل عدالت میں جا کر ان رعایتوں کو واضح کر دیتا ہے اور میں بچ جاتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے' کیونکہ عام آدمی تو قانون اور شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتے' لہٰذا قانونی ماہرین عدالت میں جا کر مقدمہ کو آگے چلاتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں قانون کے ماہرین ''فقہاء'' کہلاتے ہیں جو کسی کی طرف سے دفاع کر سکتے ہیں' کسی فریق کی طرف سے جا کر اس کے مقدمے کو پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں عدالتی نظام میں یہ قانونی معاونت وکیل حضرات کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا کوئی مقدمہ ہے' لیکن آپ اس کو صحیح طور پر عدالت میں پیش کرنے کی استطاعت اور صلاحیت نہیں رکھتے تو آپ ایک وکیل کی مدد حاصل کر سکتے ہیں' لیکن اس میں جھوٹ نہیں ہونا چاہیے' ورنہ یہ حرام ہو جائے گا۔

اثباتِ دعویٰ کے اصول

اب ہم دوسری حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے بیٹے ہیں —— اور انہیں ''حِبْرُ الْاُمَّة'' کہا گیا ہے کہ یہ امت میں قرآن مجید کے بہت بڑے عالم تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کر رہے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ، لَادَّعٰى رِجَالٌ اَمْوَالَ قَوْمٍ وَّدِمَاءَ هُمْ، وَلٰكِنَّ الْبَيِّنَةَ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ))

''اگر لوگوں کو ان کے دعویٰ کے مطابق (بلاتحقیق) دے دیا جائے تو لوگ دوسروں کے اموال اور خون پر دعویٰ کرنے لگیں' لہٰذا اصول یہ ہے کہ مدعی ثبوت پیش کرے اور مدعا علیہ اگر انکاری ہو تو قسم اٹھائے۔''

اس روایت میں اثباتِ دعویٰ کے حوالے سے ایک سنہری اصول دیا گیا کہ جس نے کسی چیز کا دعویٰ کیا ہے تو وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل یا ثبوت پیش کرے گا اور جو مدعا علیہ ہے' اس کے لیے قسم اٹھا لینا کافی ہو جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی دعویٰ کرے کہ یہ مکان میرا ہے' خدا کی قسم میرا ہے! تو اسے کہا جائے گا کہ یہ قسم یہاں نہیں چلے گی۔ اگر تم نے اس مکان کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہے تو کوئی دلیل یا ثبوت یا گواہ لاؤ۔ بغیر دلیل اور ثبوت کے تمہارا دعویٰ قابل قبول نہیں ہے۔ دوسری طرف جو مدعا علیہ ہے اس کے لیے دلیل ضروری نہیں ہے' اگر وہ حلف اٹھا لے تو بھی فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے قبضہ کا دعویٰ کیا ہے تو آپ کو اپنے قبضے کا ثبوت فراہم کرنا ہے کہ یہ میری چیز ہے' جبکہ جس کے قبضے میں ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ثبوت پیش کرے' لہٰذا اگر وہ قسم کھا لے' حلفیہ بیان دے دے تو دعویٰ باطل ہو جائے گا۔

زیر مطالعہ روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے پیش نظر — جو وہ مانگ رہے ہوں' جو وہ دعویٰ کر رہے ہوں' جس چیز پر اپنا حق جتلا رہے ہوں —— دے دیا جائے تو اس طرح سارے لوگ دوسرے لوگوں کے اموال کے اوپر

قبضہ کرنے کے لیے دعوے لے کر کھڑے ہو جائیں گے‘ بلکہ ان کی جانوں کے بھی مدعی بن جائیں گے۔ مثلاً قتل کا معاملہ ہے اور آپ نے جھوٹے طور پر قسم کھالی ہے کہ میں نے اسے فلاں شخص کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا تو آپ کے بیان پر اُس شخص کو پھانسی پر نہیں لٹکا دیا جائے گا‘ بلکہ گواہ پر جرح ہوگی اور دیکھا جائے گا کہ واقعتاً یہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔ اس کے بیان میں کوئی تضاد تو نہیں ہے۔ صرف قسم کھانے کی بنیاد پر کسی کا جرم ثابت نہیں ہو جائے گا۔ اسی طرح زنا کے معاملہ میں بھی جب تک چار گواہ نہیں آئیں گے تو وہ ثابت نہیں ہوگا۔

آپ کو معلوم ہے کہ دلیل اور ثبوت نہ ہونے کی بنا پر قاضی شریحؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقدمہ خارج کر دیا تھا۔ معاملہ کچھ یوں تھا کہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہوگئی اور ایک یہودی کے ہاں سے برآمد ہوگئی۔ مقدمہ عدالت میں آیا۔ حضرت علیؓ مدعی اور یہودی مدعا علیہ ہے۔ ایک طرف امیر المؤمنین‘ بہت بلند مرتبہ صحابی‘ حضور ﷺ کے داماد اور حضور ﷺ کے چچازاد بھائی‘ جبکہ دوسری طرف ایک عام یہودی تھا۔ قاضی شریح نے کہا: اے ابوالحسن! آپ اپنا دعویٰ پیش کیجیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: قاضی صاحب! آپ نے پہلی ناانصافی تو یہیں کر دی۔ آپ کو کہنا چاہیے تھا: اے علی! اپنا دعویٰ پیش کرو‘ جبکہ آپ نے مجھے ابوالحسن کہہ کر پکارا ہے‘ حالانکہ کنیت کے ساتھ پکارا جانا عزت و تکریم کے لیے ہوتا ہے۔ اس وقت نہ تو میں خلیفۃ المسلمین ہوں اور نہ میں کوئی بلند مرتبہ صحابی۔ اس وقت میری حیثیت تو بس ایک مدعی کی ہے۔ پھر آپؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ یہ زرہ میری ہے۔ قاضی نے کہا: گواہ لائیے! آپؓ نے کہا: گواہ حاضر ہیں۔ ایک گواہ میرا بیٹا حسن ہے اور دوسرا گواہ میرا غلام قنبر ہے۔ اب سنیے‘ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ دعویٰ کے ساتھ بیٹے اور غلام کی گواہی قبول نہیں ہے‘ کوئی اور ہے تو لائیے! چونکہ یہ امکان موجود ہے کہ بیٹا اور غلام طرف داری کر سکتا ہے‘ لہٰذا ان کی گواہی قبول نہیں ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے پاس تو کوئی اور گواہ نہیں ہے۔ اس پر قاضی صاحب نے فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف دیا اور اُن کا دعویٰ خارج کر دیا۔

آزاد عدلیہ ہی کرپشن روک سکتی ہے!

یہ ہے آزاد عدلیہ کی مثال کہ قاضی نے وقت کے خلیفہ کے خلاف فیصلہ دیا اور خلیفہ نے بھی بغیر کسی تردّد کے اس فیصلہ کو قبول کیا۔ آج کل ہمارے ملک میں بھی آزاد عدلیہ کی تحریک چل رہی ہے۔ انتظامیہ اگر عدلیہ کے تابع نہ ہو تو وہ لازماً ظلم کرے گی‘ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نہ کرے۔ کیونکہ اصول آپ کو معلوم ہے کہ

Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely.

یعنی جہاں اختیار ہوتا ہے‘ طاقت ہوتی ہے تو وہاں کرپشن کا امکان پیدا ہو جاتا ہے اور جہاں انسان کو مکمل اختیار حاصل ہو جائے تو وہاں کرپشن کا امکان بھی لامحدود ہوگا۔ اس کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح کروڑوں کے غبن ہوئے ہیں اور کس طرح ہماری بہترین کمپنیوں اور اداروں کو نجکاری کے نام پر کوڑیوں کے دام بیچا گیا ہے۔ اس ساری لوٹ مار سے قوم کو بے حد و حساب نقصان پہنچایا گیا ہے۔ غریب آدمی پس رہا ہے‘ لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ ایک ماں نے اپنی تین بچیوں سمیت ریلوے انجن کے سامنے کود کر اپنی جان کیوں دے دی؟ اس لیے کہ یہاں معاشی ظلم ہے اور یہاں سماجی عدل نہیں ہے۔

ایک تو اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی ہے‘ اور ایک عدالتی نظام اور اس سطح پر عدل کے تقاضے ہیں۔ حضور ﷺ نے اس کے لیے بھی بہترین اصول بتائے ہیں جو آج بھی دنیا میں مانے جاتے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ دونوں فریقوں کی بات سنے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرو۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ شک کا فائدہ ملزم کو پہنچے گا اور شک کی بنا پر آپ کسی کو سزا نہیں دے سکتے۔ یہ تمام اصول محمد رسول اللہ ﷺ نے دیے ہیں۔ اسی طرح ایک اصول یہ ہے کہ اگر آپ نے کوئی دعویٰ کیا ہے تو ثبوت پیش کرنا آپ کے ذمے ہے‘ ورنہ وہ دعویٰ خارج ہو جائے گا‘ البتہ مدعا علیہ کی قسم کا بھی اعتبار ہوگا۔

متذکرہ بالا مقدمہ میں حضرت علیؓ مدعی تھے کہ یہ زرہ میری ہے اور یہودی کہہ رہا تھا کہ یہ میری ہے‘ وہ مدعا علیہ تھا۔ اب پہلا مرحلہ یہ تھا کہ دلیل لائیے‘ گواہ لائیے‘ نہیں ہے

تو دعویٰ خارج۔ فرض کیجیے کوئی گواہ بھی آ جاتا ہے مگر مدعا علیہ قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ یہ چیز میری ملکیت ہے تو اس صورت میں بھی مدعا علیہ کی قسم کو تسلیم کیا جائے گا اور دعویٰ خارج کر دیا جائے گا۔ اس لیے کہ قبضہ فی نفسہ ایک دلیل ہے۔ آج بھی دنیا میں مانا جاتا ہے کہ ملکیت کے دس میں سے نو حصے قبضہ ہے۔ چنانچہ آپ مدعی بن کر آ گئے ہیں تو آپ دلائل لائیں اور جو قابض ہے اُس کے پاس تو قبضہ خود ایک دلیل موجود ہے۔

قاتل کو معاف کرنے کا اختیار صرف وارثین کو ہے!

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے عدالتی نظام میں قتل کے مقدمے میں مقتول کے ورثاء کو مدعی نہیں مانا جاتا' بلکہ یہاں یہ اصول رائج ہے کہ ایسے مقدمات میں مدعی حکومت ہے۔ یہ بات اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق قتل کے مقدمہ میں مقتول کے ورثاء ہی مدعی ہیں اور انہیں ہی یہ حق حاصل ہے کہ خواہ وہ قاتل کو بغیر کچھ لیے چھوڑ دیں یا خون بہا لے کر چھوڑ دیں۔ اس صورت میں حکومت' عدالت اور ریاست کا سربراہ کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے دستور میں یہ دفعہ موجود ہے کہ ریاست کا سربراہ قاتل کو معاف کر سکتا ہے' جو کہ سراسر غلط اور بالکل خلافِ اسلام ہے۔

فرض کیجیے ایک قتل کا مقدمہ ہے۔ عام عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ ہاں یہی شخص مجرم ہے۔ پھر سیشن کورٹ میں بھی ثابت ہو گیا۔ ہائی کورٹ میں گئے تو وہاں بھی ثابت ہو گیا۔ پھر سپریم کورٹ نے بھی یہی فیصلہ سنایا کہ یہی شخص قاتل ہے۔ اس سب کے باوجود اب بھی صدرِ مملکت اسے معاف کر سکتا ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے اور اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قاتل کو معاف کرتا پھرے۔ ہاں مقتول کے وارثوں کو حق حاصل ہے کہ تمام فیصلوں کے بعد بھی اسے معاف کر سکتے ہیں اور اس کے اندر بہت بڑی حکمت ہے۔ آپ اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ دو پارٹیوں کے درمیان دشمنی چل رہی ہے' کچھ ان کے قتل ہو گئے تو مقتولین کے لوگوں نے قاتلوں کے کچھ لوگ مار ڈالے۔ دیہات میں اکثر خاندانی بنیادوں پر قتل در قتل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے جو کسی صورت رکنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کو روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص قاتل ثابت ہو چکا ہے تو اب اس کی

جان مقتول کے ورثاء کے ہاتھ میں دے دی جائے' کہ چاہے تو بخش دیں' چاہے تو جان لے لیں۔ اب اگر مقتول کے ورثاء اس قاتل کو بخش دیتے ہیں اور معاف کر دیتے ہیں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قاتل اور اس کے خاندان کے اوپر کتنا گہرا اثر ہو گا اور وہ ان کے کس قدر ممنونِ احسان ہو جائیں گے۔ اس طرح قتل در قتل کا نہ رُکنے والا سلسلہ خود بخود رک جائے گا اور پھر جوابی قتل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ قتل کے مقدمے میں مدعی حکومت نہیں' بلکہ مقتول کے ورثاء ہیں۔

الغرض رسول اللہ ﷺ نے عدالتی سطح پر انصاف کے حوالے سے بہت بیش بہا اور قیمتی اصول بتائے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہی انسان عدل کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اصولوں کو اپنی زندگیوں میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتOO

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات)

بقیہ: بیان القرآن

آیت ۳۳ ﴿لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ ''تمہارے لیے ان (قربانی کے جانوروں) میں نفع ہے ایک وقتِ معیّن تک''

یعنی قربانی کے جانوروں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے۔ مثلاً ان پر سواری کی جا سکتی ہے' ان کی اون وغیرہ کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے' دودھ پیا جا سکتا ہے اور اس طرح کے دوسرے فوائد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

﴿ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۝۳۳﴾ ''پھر ان کی اصل منزل یہ قدیم گھر ہی ہے۔''

یعنی پھر قربانی کے دن ان جانوروں کو لے جا کر بیت اللہ میں پیش کرنا ہے۔ اصل ''مَنْحَر'' (قربان گاہ) تو بیت اللہ ہی ہے' مگر اسے منیٰ تک وسعت دے دی گئی ہے۔ پرانے زمانے میں قربان گاہ مَروہ کی پہاڑی کے پاس ہوا کرتی تھی اور منیٰ کے جس علاقے میں آج کل قربانی کی جاتی ہے وہ بھی دراصل اسی وادی میں شامل ہے جو مروہ سے شروع ہوتی ہے۔

❁❁❁

ہجرِ قرآن

اور اس کے مختلف مظاہر

جمیل الرحمٰن عباسی

ہجر یا ہجران کا لفظی مطلب چھوڑنا‘ ترک کرنا یا دور ہونا ہے۔ ہجرِ قرآن وہ جرمِ عظیم ہے جو نبی اکرم ﷺ کی سفارش و شفاعت کی امید لگائے انسان کو آپ ﷺ کی شکایت و استغاثہ سے دوچار کر دیتا ہے۔ سورہ الفرقان میں قیامت کے ذکر کے دوران فرمایا گیا: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾ ’’اور پیغمبر کہیں گے کہ اے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا‘‘۔ گویا نبی اکرم ﷺ اللہ کی جناب میں فریاد کرتے ہوئے ان لوگوں کی شکایت لگائیں گے جنہوں نے قرآن کے ساتھ ہجر روا رکھا تھا۔

ہجرِ قرآن سے کیا مراد ہے

امام منصور ماتریدیؒ لکھتے ہیں:

’’ہجرِ قرآن یا ترکِ قرآن سے قرآن پر عمل نہ کرنا‘ اس سے فائدہ نہ اٹھانا یا اسے فضول شے قرار دینا مراد ہے۔‘‘ (تأویلات اہل السنۃ)

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

’’قرآن پر ایمان نہ لانا‘ بطور کلام اللہ اس کی تصدیق نہ کرنا‘ قرآن سے تذکیر حاصل نہ کرنا اور اس پر تدبّر نہ کرنا‘ یا قرآن پر عمل نہ کرنا‘ اس کے احکام کی پیروی نہ کرنا‘ اس کے منع کیے گئے امور سے اجتناب نہ کرنا‘ یا قرآن کو چھوڑتے ہوئے گانے بجانے یا کھیل تماشے میں مشغول ہونا‘ یا کسی خلافِ قرآن شعر‘ قول یا کلام (یعنی فکر و فلسفہ) کی پیروی کرنا‘ یا اس کے بتائے ہوئے طریق زندگی کے علاوہ کسی اور طریقے کی پیروی کرنا‘ یہ تمام ترکِ قرآن کی صورتیں ہیں۔ البتہ یہ تمام اَشکال اپنی شناعت میں برابر نہیں‘ بلکہ ہر ایک قسم کا حکم مختلف ہوگا۔‘‘ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

’’قرآن کی تصدیق نہ کرنا‘ اس میں تدبر نہ کرنا‘ اس پر عمل نہ کرنا‘ اس کی تلاوت نہ کرنا‘ اس کی صحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا‘ اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا‘ یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہوسکتی ہیں۔‘‘ (تفسیر عثمانی)

دُوریٔ قرآن کے مختلف مظاہر

جیسا کہ اوپر بیان ہوا‘ ترکِ قرآن کی مختلف اقسام اور مظاہر ہیں۔ ان کا ایک مختصر سا بیان درج ذیل ہے:

ترکِ ایمان

اس سے مراد قرآن حکیم کو اللہ عزوجل کی طرف سے نازل کردہ برحق کلام نہ ماننا یا اسے جادو‘ شاعری‘ کلامِ انسانی یا کلامِ نبوی قرار دینا ہے۔ یہ کافروں کا طرزِ عمل ہے۔ الحمد للہ‘ مسلمان اس طرح کے ترکِ قرآن سے محفوظ ہیں اور یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔

ترکِ یقین یا شک

قرآن کو صرف اللہ کا کلام مان لینا کافی نہیں ہے‘ بلکہ مطلوب یہ ہے کہ اس حقیقت پر پختہ یقین بھی حاصل ہو جائے کہ یہ کلام برحق ہے جو اللہ کی طرف سے ہماری ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اور ہماری فوز و فلاح کا انحصار اسی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے کہ: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (النساء:۱۳۶) ’’اے ایمان والو! یقین لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو اُس نے پہلے نازل فرمائی‘‘۔ ارشادِ باری ہے: ﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۵۳) ’’ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے کائنات میں بھی اور خود ان کے اندر بھی یہاں تک ان پر واضح ہو جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پر حقیقی ایمان یا دلی یقین رکھنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝۱۱۴﴾ (الانعام) ’’جنہیں ہم

نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے' پس تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔''

شک یقین کا متضاد ہے' اس میں انسان کسی چیز کا انکار تو نہیں کرتا لیکن اس کی حقانیت پر مکمل یقین بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جا بجا شک کی مذمت فرمائی ہے: ﴿فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ (ھود) ''پس آپ اس (قرآن) کے بارے میں شک میں مبتلا نہ ہوں' بے شک یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔ ﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾﴾ (الشوریٰ) ''اور ان (رسولوں) کے بعد جن لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا گیا وہ اس میں خلجان آمیز شک کرنے لگے''۔ شک سے محفوظ یقین قلبی کی اس قدر اہمیت ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ ایمانِ حقیقی کی علامت ہے' ارشاد گرامی ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا.....﴾ (الحجرات:۱۵) ''ایمان والے تو صرف وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر پھر کسی شک میں نہ پڑے.....''

اس یقین و شک کا فرق عالمِ آخرت بلکہ اس کی پہلی منزل' قبر ہی میں ظاہر ہو جائے گا جب نبی اکرم ﷺ کی رسالت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''مؤمن یا یقین رکھنے والا کہے گا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو ہمارے پاس تشریف لائے واضح نشانیوں اور مکمل ہدایت کے ساتھ' ہم نے ان کی بات کو مانا' ان کی دل سے تصدیق کی اور ان کے احکامات کی پیروی کی۔ اور منافق یا شک رکھنے والا کہے گا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے لوگوں کو کچھ باتیں کرتے پایا پس میں نے بھی (بغیر دلی تصدیق و یقین کے) وہی باتیں کرنا شروع کر دیں۔'' (صحیح البخاری)

ترکِ محبت

انسان اللہ تعالیٰ کی محبت کے بغیر سچا مسلمان نہیں بن سکتا اور اللہ کی محبت کی ایک نشانی قرآن پاک کی محبت بھی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جو قرآن سے محبت کرتا ہے وہی اللہ سے بھی محبت کرتا ہے اور جو قرآن سے محبت نہیں کرتا وہ اللہ سے محبت نہیں کرتا اور قرآن کی محبت کی نشانی رات دن بکثرت تلاوت اور حاملینِ قرآن کی محبت ہے''۔ سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں: ''اللہ کی محبت کی نشانی قرآن سے محبت ہے۔'' (قوت القلوب لابی طالب المکی)

امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے بغیر انسان صاحب ایمان نہیں کہلا سکتا' اسی طرح کلام اللہ سے محبت' محبت الٰہی میں سے اور جزو ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے کہ اس کے دل میں اللہ کی کتنی محبت ہے تو وہ یہ دیکھے کہ اسے قرآن سے کتنی محبت ہے' پس جتنی قرآن سے محبت ہوگی اسی قدر اللہ کی محبت بھی ہوگی۔ اسی محبت کا مظہر تھا کہ نبی اکرم ﷺ دوسروں سے سماعت قرآن پسند فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے تلاوت سنا کرتے تھے اور کبھی تو رونے بھی لگتے تھے۔ اسی محبت کا اظہار سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یوں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن پاک سے کبھی بھی ہمارے دل نہیں بھر سکتے۔'' (روضة المحبین' الدواء الشافی)

ترکِ تعظیم

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کے ناتے دنیا کی تمام مادی چیزوں سے عظیم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ (یونس) ''وہ (قرآن) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جو لوگ اکٹھی کر رہے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ (الحجر) ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو سات' بار بار دہرائی جانے والی آیات اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ پس آپ اپنی نگاہیں اس ساز و سامان پر نہ لگائیں جو ہم نے مختلف گروہوں کو برتنے کے لیے دیا ہے''۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جس کو قرآن کی نعمت سے نوازا گیا اور اس نے کسی کے پاس کوئی دنیاوی نعمت دیکھ کر یہ سمجھا کہ اُسے مجھ سے بہتر دیا گیا تو اس نے ایک گھٹیا چیز کی تعظیم کی اور قرآن جیسی عظیم چیز کو حقیر سمجھا۔'' (تفسیر کبیر)

ترکِ تلاوت

قرآن کریم پر ایمان اور اس سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس کی تلاوت کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾﴾ (البقرة) ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' درحقیقت

یہی لوگ اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ اور جو اس کو نہیں مانتے درحقیقت وہی نقصان اٹھانے والے ہیں‘‘۔ اسی طرح دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾﴾ (الکھف) ’’اور تلاوت کیا کرو اس کی جو کتاب میں سے تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے۔ اُس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی بھی نہیں‘ اور تم اس کے سوا کہیں جائے پناہ نہ پاؤ گے۔‘‘

نبی اکرم ﷺ نے تلاوت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ’’سب سے ویران گھر وہ ہے جس میں اللہ کی کتاب میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ پس تم قرآن کی تلاوت کیا کرو کیونکہ تمہیں اس پر ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔‘‘ (سنن ترمذی)۔ مزید فرمایا: ’’قرآن کی تلاوت کیا کرو‘ پس وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے سفارشی بن کر آئے گا۔‘‘ (صحیح مسلم)۔ اور فرمایا: ’’قرآن سیکھو اور پھر اس کی تلاوت کیا کرو‘‘۔ (سنن ترمذی)

تلاوت اچھے سے اچھے انداز میں کرنی چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کی کتاب کو سیکھو‘ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو پختہ رکھو اور اچھے انداز سے اس کی تلاوت کیا کرو۔‘‘ (مسند احمد) مزید فرمایا: ’’جو قرآن کو اچھے طریقے سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔‘‘ (سنن ابوداؤد)

ترکِ تعلّم و تعلیم

قرآن کا یہ بھی حق ہے کہ اس کی قراءت و تجوید اور ترجمہ و تفسیر کو سیکھا جائے اور پھر دوسروں کو بھی سکھایا جائے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ’’قرآن سیکھو اور دوسرے لوگوں کو سکھاؤ‘‘۔ (مستدرک حاکم)۔ اسی طرح فرمان رسول اللہ ﷺ ہے: ((خَیْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) (صحیح البخاری) ’’تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں‘‘۔ نبی اکرم ﷺ نے قرآن سیکھنے کے اجر و ثواب کو بیان کرنے کے لیے تشبیہہ دیتے ہوئے فرمایا: ’’علی الصبح مسجد میں جا کر دو آیتیں سیکھنا دو فربہ اونٹنیوں سے بھی بہتر ہے۔‘‘ (صحیح البخاری)

ترکِ فہم و تدبّر

قرآن کتابِ ہدایت ہے‘ جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ قرآن کا بتایا ہوا طریق زندگی ہی سب سے بہترین ہے: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾ (بنی اسرائیل:۹) ’’یہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھا ہے‘‘۔

اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے سمجھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس ہدایت سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾﴾ (صٓ) ’’یہ بابرکت کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں‘‘۔ ایک جگہ پر فرمایا گیا: ﴿كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (یونس) ’’اسی طرح ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کی ہیں تاکہ لوگ ان میں غور و فکر کریں‘‘۔ لیکن انسانوں کی اکثریت قرآن کی تفہیم سے دور رہی‘ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾﴾ (بنی اسراء یل) ’’اور ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر آیتیں بیان کی ہیں تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں‘ لیکن لوگوں کے بھاگنے ہی میں اضافہ ہوا ہے‘‘۔ اسی عدمِ تدبر کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾﴾ (محمد) ’’کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے ہی لگ چکے ہیں‘‘۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات نبی اکرم ﷺ سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت پڑھ کر اتنا روئے کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک اور سجدے کی زمین بھی گیلی ہوگئی۔ میں نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول ﷺ آپ اتنا کیوں روتے ہیں جبکہ اللہ نے تو آپ کی اگلی پچھلی تمام لغزشوں کی مغفرت فرما دی ہے‘‘۔ آپ ﷺ فرمانے لگے: ’’کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں جبکہ اس نے مجھ پر یہ آیات نازل کی ہیں: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.....﴾ (آل عمران: ۱۹۰) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ہلاک ہو جائے وہ شخص جو انہیں پڑھے تو سہی لیکن ان پر تدبر و غور و فکر نہ کرے۔‘‘ (صحیح ابن حبان)۔ تدبرِ قرآن کی فضیلت کا یہ عالَم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ’’جلدی جلدی پورا قرآن پڑھ جانے سے‘ ٹھہر ٹھہر کر غور و فکر کے ساتھ سورۂ بقرہ و آلِ عمران کی (مقدار کے برابر) تلاوت کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔‘‘

ترکِ پیروی و عمل

قرآن کی تلاوت‘ تفہیم و تدبر سے مقصود یہی ہے کہ انسان اس ہدایت نامے پر عمل کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾﴾ (الانعام) ’’اور یہ بابرکت کتاب ہم نے نازل کی ہے پس اس کی پیروی کرو

اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے''۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب کا علم حاصل کرو اور پھر اس کی پیروی کرو۔'' (مسند احمد)۔ قرآن پاک کو پڑھنے اور سمجھنے لیکن عمل نہ کرنے والے کو نبی اکرم ﷺ نے فاسق و فاجر قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''لوگوں میں سب سے برا' اللہ کی نافرمانی پر جری' وہ فاجر شخص ہے جو قرآن پڑھتا تو ہے لیکن اس کی کسی بات پر عمل نہیں کرتا۔'' (مسند احمد)۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا: ''اس فاسق (نافرمان) شخص کی مثال جو قرآن (محض) پڑھتا ہے گلِ ریحان کی طرح ہے کہ اس کی خوشبو اچھی ہے لیکن اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔'' (صحیح بخاری)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قرآن یا تو تمہارے حق میں حجت بنے گا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا۔'' (صحیح مسلم)۔ اسی کی وضاحت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے اس فرمان میں ہوتی ہے: یہ قرآن تمہارے لیے باعث اجر بھی ہوسکتا ہے اور باعث عذاب بھی' پس قرآن کی پیروی کرو اور قرآن کو اپنے پیچھے مت چلاؤ۔ پس جو کوئی قرآن کی پیروی کرے گا یہ قرآن اسے جنت کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دے گا اور جو کوئی قرآن کو اپنی خواہشات کے پیچھے چلانے کی کوشش کرے گا قرآن اسے گُدی سے پکڑ کر دوزخ میں پھینک دے گا''۔ (سنن دارمی) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قرآن ایسا سفارشی ہے جس کی سفارش مانی جائے گی اور یہ ایسا شکایتی ہے جس کی شکایت بھی سنی جائے گی۔ جو شخص قرآن کو اپنا راہنما بنائے گا' قرآن اسے جنت میں پہنچا دے گا اور جو اسے اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دے گا قرآن اس کو دوزخ میں پھینک دے گا۔'' (صحیح الجامع)

ترکِ توجہ و استماع

قرآن پاک کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب قرآن کا ترجمہ و تفسیر یا اس کی تعلیمات پر مبنی خطبات دیے جا رہے ہوں تو توجہ کے ساتھ ان کی سماعت کی جائے۔ کافروں کا یہ طرزِ عمل تھا کہ وہ قرآن کی سماعت کے دوران شور مچایا کرتے تھے' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶﴾ (حٰمٓ السّجدة) ''اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو اور (جب دوسرے پڑھنے لگیں تو) شور مچا دیا کرو تا کہ تم غالب رہو''۔ کافروں کا یہ بھی طرزِ عمل ہوا کرتا ہے کہ وہ نصیحت کی بات کو توجہ سے نہیں سنتے: ﴿مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲﴾ (الانبیاء) ''ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو بھی نئی

نصیحت آتی ہے تو کھیل کود میں مگن ہو کر غافل دلوں کے ساتھ اسے سنتے ہیں''۔ قرآن کے ذریعے سے کی جانے والی نصیحت سے منہ پھیرنا اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ۝۲۲﴾ (السّجدہ) ''اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے اور وہ پھر بھی منہ موڑے رہے' ایسے مجرموں سے ہم نے ضرور بدلہ لینا ہے۔''

قرآن کی نصیحت و ہدایت سے فائدہ اٹھانے کی لازمی شرط دل لگا کر توجہ سے سننا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝۳۷﴾ (قٓ) ''بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جس کا دل (زندہ) ہو یا وہ کان لگا کر سنے اور وہ حاضر و متوجہ بھی ہو''۔ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی بغور سماعت کا اجر بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''جس نے اللہ کی کتاب کی ایک آیت بھی غور سے سنی اس کے لیے دگنی نیکی لکھی جائے گی اور جو قرآن کی تلاوت کرے گا تو اس کے لیے قیامت کے دن یہ تلاوت نور ہوگی۔'' (مسند احمد)

ترکِ حفظ و اتقان

قرآن پاک کو ہمیشہ محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حفظ قرآن کا سلسلہ شروع کیا اور اس کا بے انتہا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہر بندے پر قرآن کا حفظ کرنا لازمی نہیں ہے لیکن یاد کرنے کے بعد اس کے حفظ کو برقرار رکھنا لازم اور اسے بھلانا گناہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں سمجھتا کہ کسی شخص کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت دی گئی ہو اور وہ اسے بھلا دے۔'' (ابوداؤد)۔ مزید فرمایا: ''قرآن کو (مسلسل تلاوت و باہمی مذاکرے کے ذریعے) یاد رکھا کرو' پس (سستی پر) وہ لوگوں کے دلوں میں سے ایسے بھاگتا ہے جیسے اونٹ رسّی تڑا کے بھاگتا ہے۔'' (صحیح بخاری)

ترکِ تزکیۂ نفس

قرآنِ حکیم باطنی اور اخلاقی امراض کا مؤثر علاج ہے۔ ارشادِ باری ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾ (یونس) ''لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا اور مؤمنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ پہنچی ہے''۔ پس قرآن سے

فائدہ اٹھا کر اصلاحِ نفس کا اہتمام نہ کرنا بھی گھاٹے کا سودا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''اور ہم قرآن نازل کرتے ہیں جو مؤمنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔''

ترکِ تبلیغ

نبی اکرم ﷺ کو تمام بنی نوعِ انسان تک پیغام ہدایت پہنچانے کے لیے بھیجا گیا اور اس مقصد کے لیے آپ ﷺ پر قرآن نازل کیا گیا۔ قرآن پاک میں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (الانعام:۱۹) ''میری طرف یہ قرآن وحی کے ذریعے بھیجا گیا تاکہ اس کے ذریعے میں خبردار کروں تم لوگوں کو بھی اور ہر اُس شخص کو بھی جس کو یہ پہنچے''۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ (المائدۃ:٦٧) ''اے رسول! پہنچایئے وہ سب کچھ جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے رسالت کا حق ادا نہ کیا''۔ نبی اکرم ﷺ اپنے بعد یہ کام اُمت مسلمہ کے ذمے لگا گئے اور حکم جاری فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً)) (صحیح البخاری) ''میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک ہی آیت پہنچا سکو''۔ مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ کی کتاب کا علم حاصل کرو اور پھر اسے پھیلاؤ'' (مسند ابی یعلیٰ)۔ ربیع بن انس البکریؒ التابعی فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے ہر پیروکار کا حق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرح لوگوں کو دین کی طرف بلائے اور انہیں خبردار کرے۔'' (تفسیر ابن کثیر)

ترکِ حفظِ حدود

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''قرآن پڑھنے کا حق یہ ہے کہ اس کے بتائے گئے حلال کو حلال جانو اور اس کے حرام کو حرام جانو۔'' (تفسیر طبری)۔ یہ حلال و حرام ہی قرآن کی حدود ہیں۔ ارشادِ باری ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿١٨٧﴾﴾ (البقرۃ) ''یہ اللہ کی حدود ہیں پس ان کے نزدیک بھی نہ پھٹکو۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں واضح کرتا ہے تاکہ لوگ تقویٰ اختیار کریں''۔ اللہ تعالیٰ نے حدود کے بارے میں فرمایا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾﴾ (البقرۃ) ''یہ اللہ کی حدود ہیں انہیں پامال مت کرو اور جو اللہ کی حدود کو توڑے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں''۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ)) (معجم الکبیر) ''جو شخص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھے اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں''۔ قرآن پر عمل نہ کرنے والے اور اس کی حدود توڑنے والے کے خلاف قرآن خود سفارش کرتا ہے' نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

> ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ قرآن پاک کو ایک انسان کی صورت عطا کرے گا۔ پھر وہ ایک بندے کا ہاتھ پکڑ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے لے جائے گا اور کہے گا: اے رب! تو نے مجھے اس کے حوالے کیا تھا لیکن اس نے مجھے بہت بری طرح اٹھایا' میری حدود پامال کیں' میرے فرائض ضائع کیے' میری نافرمانی کو شیوہ بنائے رکھا اور میری اطاعت کو ترک کیا۔ اس طرح قرآن لگاتار اس پر دفعات لگاتا رہے گا' یہاں تک کہ کہا جائے گا کہ اس کے ساتھ اپنا معاملہ خود کرلو۔ اس پر قرآن اس کا ہاتھ پکڑ لے گا اور نہیں چھوڑے گا یہاں تک کہ اسے دوزخ میں ایک چٹان پر اوندھے منہ گرا دے گا۔'' (مصنّف ابنِ ابی شیبہ)

ترکِ نفاذ و تحکیم

انسانوں کو اجتماعی زندگی کے لیے قانون اور نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قرآن و سنت میں مکمل قانون عطا کر کے اسے نافذ نہ کرنا جرمِ عظیم قرار دیا ہے۔ سورۃ المائدۃ میں تین مقامات پر فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٤٤﴾﴾ (المائدۃ) ''اور جو لوگ اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں''۔ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٤٥﴾﴾ (المائدۃ) ''اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں''۔ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤٧﴾﴾ (المائدۃ) ''اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں''۔ قرآن و سنت کے قانون کو نافذ نہ کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ دنیا ہی میں اس کی سزا دے دی جاتی ہے' نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو ظالم حکمران قرآن کے مطابق فیصلے نہ کرے اللہ اسے توڑ دے گا'' (جامع الاصول) دوسرے مقام پر فرمایا: ''کوئی بھی قوم اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کو معطل نہیں کرتی مگر اللہ ان کے درمیان لڑائی ڈال دیتا ہے۔'' (شعب الایمان)۔ مزید فرمایا: ''جب مسلمانوں کے حکمران کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہ کریں اور اللہ کے نازل کردہ

قوانین سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان خانہ جنگی ڈال دیتا ہے۔'' (ابن ماجہ)

ترکِ انشراح یا احساسِ حرج

قرآن حکیم سے بطورِ کلامِ الٰہی اور ہدایت ابدی' محبت لازم ہے۔ اسی جذبہ محبت ہی کے زیر اثر انسان انشراحِ صدر اور خوشدلی کے ساتھ اس آسمانی ہدایت پر عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ خوشدلی کا متضاد رویہ گھٹن یا تنگی (حرج) محسوس کرنا ہے۔ امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

''دین میں بگاڑ پیدا کرنے والا ہر شخص قرآن سے تنگی محسوس کرتا ہے اور مجرم لوگ اپنے جرائم کے خلاف بولتی آیات سے گھٹن یا تنگی محسوس کرتے ہیں۔ اس تنگی یا حرج کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ قرآن انسانوں کی مکمل رہنمائی کے لیے ناکافی ہے اور انسان زندگی بسر کرنے کے طریقے میں مکمل طور پر عقلی علوم' قیاس آرائیوں' انسانی آراء اور سیاسی نظریات کا محتاج ہے۔ پس اس طرزِ فکر سے بھی انسان کے دل میں قرآن کے خلاف ایک گھٹن سی پیدا ہوتی ہے۔'' (ملخص از الفوائد)

آج کل بھی بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن وسنت جدید دور میں قابلِ عمل اور قابلِ نفاذ ہی نہیں ہیں اور اسلامی نظام' عصرِ حاضر کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ بعض لوگوں کا یہ نظریہ بن جاتا ہے کہ قرآن وسنت کا اجتماعی اور ریاستی نظام سے کوئی تعلق نہیں اور بعض لوگ تو کھلم کھلا اسلام کی سزاؤں کو وحشیانہ تک قرار دیتے ہیں۔ یہ تمام خام خیالیاں' قرآن سے تنگی یا حرج ہی کی صورتیں ہیں۔ پھر ایسے لوگ اجتماعی نظام کے لیے مختلف فلسفوں اور نظریات کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن کہیں سے بھی نہ ان کو ہدایت میسر آتی ہے اور نہ ہی ان کی اجتماعیت کے مسائل حل ہوتے ہیں' جیسا کہ ہمارے ملک کا حال ہے۔ انہی لوگوں کے بارے میں فرمانِ نبوی ﷺ ہے: ((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ)) (سنن الترمذی) ''جو کوئی قرآن (وسنت) کے علاوہ کہیں اور سے ہدایت تلاش کرنا چاہے گا تو اللہ اسے گمراہ کردے گا۔''

علامہ اقبال کی پکار

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے علامہ اقبال کو بجا طور پر ''واقفِ مرتبہ ومقام قرآن'' اور ''داعی الی القرآن'' قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن سے دُوری اور کتابِ الٰہی سے بُعد ہی مسلمانوں کے زوال واضمحلال اور امت مسلمہ کے نکبت وافلاس اور ذلت وخواری کا اصل سبب ہے۔ چنانچہ ''جوابِ شکوہ'' میں اللہ رب العزت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ اپنے فارسی کلام میں نہایت پُرشکوہ الفاظ اور حد درجہ دردانگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کرتے ہیں: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتاب زندۂ

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہوگیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!
اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے) اُٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے! (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!)''

کرنے کا کام ـــــ تمسّک بالقرآن

یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہماری نجات اور بچاؤ کا انحصار قرآنِ مقدس کو تھامنے ہی میں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''جو قرآن کو تھام رکھے گا نجات پائے گا اور جو اسے ترک کرے گا ہلاک ہو جائے گا۔'' (مسند احمد) پس ہمیں چاہیے کہ قرآن کو مضبوطی سے تھام لیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے پکڑ لو''۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قرآن ہی اللہ کی رسی ہے جو زمین سے آسمان تک تنی ہوئی ہے'' (صحیح الجامع)۔ نیز فرمایا: ''اس قرآن کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسرا اللہ کے ہاتھ میں' پس اسے مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو نہ کبھی گمراہ ہوگے اور نہ ہی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' (معجم کبیر)۔ تمسک قرآن کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن پاک کی تجوید وقراءت سیکھیں اور روزانہ اس کی تلاوت کریں' تعلیم و تعلّم قرآن کی مجالس میں حاضر ہوں' نیز قرآن کے ترجمہ وتفسیر کا علم بھی حاصل کریں۔ انفرادی سطح پر قرآنی تعلیمات پر عمل کریں اور اجتماعی وملکی سطح پر قرآن وسنت سے ماخوذ نظام وقوانین کے قیام ونفاذ کے لیے کسی اجتماعیت میں شامل ہو کر منظّم جِدّوجُہد کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہجرِ قرآن سے بچائے اور تمسک بالقرآن کی توفیق عطا فرمائے' آمین!

❁ ❁ ❁

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

مقدّمہ

الحمد للّٰہ الذی انزل علٰی عبدہ الکتاب ولم یجعل له عوجا، وصلّی اللّٰہ وسلّم علٰی من کانت حیاته واخلاقه للقرآن تطبیقا قولا وعملا وخُلقا.....

امّـا بـعـد: الحمدللہ ۱۴۳۲ھ کے بعد میری کتاب ''قواعدِ قرآنیہ'' کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ زیرِنظر کتاب اسی کا خلاصہ ہے' جسے میں قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ کیونکہ کئی حضرات نے بار بار مطالبہ کیا کہ اصل کتاب کو مختصر کیا جائے' تاکہ اِسے مساجد میں پڑھنے میں آسانی ہو' اور جو زبانیں مسلمان بولتے ہیں اُن زبانوں میں اِس کا ترجمہ کیا جا سکے۔ اور اس لیے بھی اختصار کر دیا کہ اصل کتاب میں بعض لمبی لمبی تفصیلات ہیں' مثلاً لغت اور بلاغت سے متعلقہ بحثیں ہیں' جسے صرف عربی کا ماہر ہی سمجھ سکتا ہے' یا پھر جو شخص معانی میں تفصیلات کا خواہش مند ہو وہ سمجھ سکتا ہے۔ البتہ قواعدِ قرآنیہ میں بیان ہونے والی مثالوں میں سے چند ایک کو ضرور ذکر کر دیا ہے۔

جو شخص حوالوں کے بارے میں تسلی کرنا چاہے میں اُسے اصل کتاب دیکھنے کا مشورہ دوں گا' زیرِنظر کتاب میں تفصیلی حوالوں کو بھی حذف کر دیا ہے' البتہ احادیث کے حوالوں کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جناب میں التجا کرتا ہوں کہ میری محنت کو قبول فرمالے' اور جو بھی اس کو پڑھے اور اس کو عام کرنے میں حصہ ڈالے' ان سب کو نفع پہنچائے۔ **والحمد للّٰہ ربّ العالمین۔**

ڈاکٹر عمر عبداللہ المقبل

استاذ کلیۃ الشریعہ والدراسات الاسلامیہ

۱۴۳۶/۳/۲۴ھ

پہلا اصول:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ ''اور لوگوں سے اچھی بات کرو!''

جیسا کہ بیان کیا جا تا ہے' مل جل کر رہنا انسان کی فطرت کا حصہ ہے اور روزانہ مختلف قسم کے معاملات کو نمٹانے کی خاطر لوگوں سے ملنا اس کی مجبوری ہے۔ اور ان لوگوں کی عقل و سمجھ اور اخلاق بھی مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ کبھی اچھی بات سنتا ہے اور کبھی بُری' اور کبھی ایسی بات سننی پڑتی ہے جس سے اس کو غصہ آجاتا ہے۔ ایسے موقع پر زیرِنظر اصول کی ضرورت پیش آتی ہے (اور لوگوں سے اچھی بات کرو) تاکہ زبان سے متعلقہ معاملات کو قابو میں لایا جا سکے۔

اس اصول کو قرآنِ کریم میں کئی جگہ تکرار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (بنی اسرائیل:۵۳)

'اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بہت ہی اچھی بات منہ سے نکالیں۔''

اور اسی کے قریب ترین اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ اہلِ کتاب سے بھی بحث و مباحثہ ہو تو عمدہ طریقے سے کرو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ (العنکبوت:٤٦)

''اور اہلِ کتاب کے ساتھ بحث و مباحثہ نہ کرو' مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو' سوائے ان کے جو ان میں ظالم ہیں۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرۃ:۸۳) ''اور لوگوں سے اچھی بات کرو۔'' بنی اسرائیل کو جو متعدد احکام دیے گئے اس ضمن میں یہ حکم آیا تھا۔

سورۃ البقرہ مدنی سورت ہے' جبکہ اس سے پہلے مکی سورت میں یہ عمومی حکم بایں الفاظ آچکا تھا: ﴿وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (بنی اسراءیل:۵۳) ''اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بہت ہی اچھی بات منہ سے نکالیں۔''

اب ہمارے سامنے مضبوط اور واضح احکام ہیں' اِن میں سے کسی چیز کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا' البتہ اہلِ کتاب کا معاملہ الگ ہے کہ بحث و مباحثہ کی صورت میں ان سے سخت بات کی جا سکتی ہے' جس کی تفصیل و دلیل گزر چکی ہے۔

ہمیں اس قاعدے کی اکثر ضرورت رہتی ہے‘ بالخصوص جب ہمیں معاملات نمٹانے میں مختلف قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے‘ اِن میں مسلمان بھی ہوتے ہیں اور کافر بھی‘ اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی‘ کوئی بڑا ہوتا ہے اور کوئی چھوٹا۔ بلکہ اچھی بات کی تو ہمیں اپنے قریبی رشتہ داروں سے معاملہ کرتے وقت ہمیشہ ضرورت رہتی ہے‘ جیسے کہ والدین‘ خاوند‘ بیوی اور اولاد‘ حتیٰ کہ جو ملازم وغیرہ ہماری خدمت کر رہے ہوتے ہیں ان کے ساتھ بھی اچھی بات کی ضرورت رہتی ہے۔

اے مؤمن! جب تم قرآن کا مطالعہ کرو گے تو تمہیں بہت سارے مواقع پر نظر آئے گا کہ قرآن نے اس امر کی تاکید کی ہے۔ اس قاعدے کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱) والدین کے ساتھ معاملہ کرتے وقت:

﴿...... وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (٢٣)﴾ (بنی اسراءیل)

''......اور نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا‘ بلکہ ان کے ساتھ ادب واحترام کے ساتھ بات چیت کرنا۔''

۲) ضرورت مند مانگنے والے سے بات چیت کرتے وقت۔ فرمایا:

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (١٠)﴾ (الضحیٰ)

''اور نہ سائل کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔''

۳) جب انسان کے پلے ایسے لوگ پڑ جائیں جن میں ادب واحترام کی کمی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (٦٣)﴾ (الفرقان)

''اور جب کم علم لوگ ان سے باتیں کرنے لگیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ سلام ہے!''

یعنی وہ لوگ اہلِ جہالت اور کم عقل لوگوں سے منہ پھیر لیتے ہیں‘ یا پھر اچھے لفظوں سے جواب دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے‘ بلکہ اس طرح کی بحثوں میں پڑ کر اپنی محنت اور وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتے۔

جب انسان دیکھتا ہے کہ قرآنِ حکیم کو ماننے والی امت اس قاعدے پر عمل کرنے میں شدید کوتاہی کا شکار ہے تو اسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس کوتاہی کی بہت ساری شکلیں ہوتی ہیں:

۱) غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت: قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اپنے دل سے پوچھے کیا ہم مسلمان اس بات کے زیادہ حق دار نہیں کہ عیسائیوں سے

زیادہ اس قاعدے پر عمل کریں؟ یہ لوگ اچھی بات کی بہت زیادہ کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اپنے دین کی طرف کھینچ کر لے آئیں‘ جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے آنے کے بعد منسوخ کر دیا ہے۔ کیا اہل اسلام اس قاعدے پر عمل کے زیادہ حق دار نہیں ہیں تاکہ لوگوں کو اس عظیم دین کی طرف لے آئیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرما لیا ہے؟

۲) والدین کے ساتھ معاملہ کرنے میں۔

۳) زندگی کے ساتھی (خاوند/بیوی) کے ساتھ معاملہ کرنے میں۔

۴) اولاد کے ساتھ معاملہ کرنے میں۔

۵) ملازمین اور خدمت گاروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں۔

دوسرا اصول:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾

''اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بُری جانو‘ اور دراصل وہی تمہارے لیے بھلی ہو‘ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو‘ حالانکہ وہ تمہارے لیے بُری ہو۔''

یہ ایک عظیم اصول ہے جس کا ہر مسلمان کی زندگی میں خاصا بڑا اثر ہے بشرطیکہ اسے یہ بات سمجھ آ جائے کہ ایمانیات کا اِس اصول سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ جان لیں اس کا نام ہے ''قضاوقدر'' پر ایمان لانا۔

یہ اصول اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے سلسلے میں بیان ہوا ہے‘ جو سورۃ البقرہ میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (٢١٦)﴾ (البقرۃ)

''اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بُری جانو‘ اور دراصل وہی تمہارے لیے بھلی ہو‘ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو‘ حالانکہ وہ تمہارے لیے بُری ہو۔ حقیقی علم اللہ ہی کو ہے‘ تم محض بے خبر ہو۔''

اسی قسم کی بات سورۃ النساء میں عورتوں سے جدائی کے حوالے سے بھی بیان ہوئی ہے‘ فرمایا:

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝۱۹﴾ (النساء)

’’گو تم انہیں ناپسند کرو‘ لیکن بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بُرا جانو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت ہی بھلائی کر دے۔‘‘

اس اصول کی مختصر سی وضاحت: ہوتا یہ ہے کہ بسا اوقات انسان پر تکلیف دہ تقدیر کا فیصلہ آ جاتا ہے‘ جو اس کے دل کو ناپسند ہوتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو وہ گھبرا جاتا ہے یا غمگین ہو جاتا ہے۔ اس کا گمان ہوتا ہے کہ اس کی ساری اُمیدوں کا جنازہ نکل گیا ہے یا اس کی زندگی ہی ختم ہو گئی ہے۔ اچانک حالات پلٹا کھاتے ہیں اور یہی تکلیف دہ تقدیر اس کے حق میں رحمت بن جاتی ہے‘ اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔

اور اس کا اُلٹ بھی ہو جاتا ہے۔ کتنے ہی انسان ایسے ہوتے ہیں جو کسی مقصد کی خاطر محنت کرتے ہیں کہ بظاہر اس میں خیر ہے اور اس کو پانے کے لیے آخری حد تک کوشش بھی کرتے ہیں‘ قیمتی سے قیمتی چیز کو حصولِ مقصد کے لیے خرچ کر ڈالتے ہیں اور نتیجہ بالکل اُلٹ نکل آتا ہے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی تو دل کو اس بات پر پختہ کر لو کہ اس قرآنی اصول پر زندگی گزارنے سے انسان کا دل اطمینان اور سکون سے بھر جاتا ہے‘ اور جس بے قراری نے لوگوں کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے یہ اس کو ختم کر دیتا ہے‘ یہ پریشانی خواہ کسی حادثے کی وجہ سے آئی ہو یا کسی بھی دن کی تکلیف دہ تقدیر کی وجہ سے ہو۔

اگر ہم قرآنِ کریم میں مذکور واقعات پر غور کریں یا تاریخ کے اوراق پلٹیں یا اپنے اردگرد کے حالات کا جائزہ لیں تو بہت سارے عبرت ناک واقعات ملیں گے۔ ہم چند ایک کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ ہر غمگین آدمی کے لیے تسلی کا سامان ہو جائے اور ہر غم زدہ دل کے زخم کے لیے مرہم بن جائے۔

۱) حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی والدہ ماجدہ کا اپنے بیٹے (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کو سمندر میں ڈالنے کا واقعہ: جب تم اس معاملے پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعونیوں کے ہاتھ لگنے کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو کس قدر تکلیف ہو سکتی تھی۔ اس سب کے باوجود اس کے نتائج کس قدر اچھے تھے اور مستقبل میں اس کے کتنے فائدے سامنے آئے۔

یہ قاعدہ بیان کرنے کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ’’اور اللہ کو خوب پتا ہے اور تمہیں کچھ معلوم نہیں!‘‘

۲) حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام کا واقعہ: غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ مذکورہ بالا آیت حضرت یوسف علیہ السلام اور آپ کے والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعہ پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

۳) اُس لڑکے کا واقعہ جسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا تھا: اُنہوں نے قتل کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝۸۰ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝۸۱﴾ (الکہف)

’’اور اُس لڑکے کے ماں باپ ایمان والے تھے‘ ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انہیں اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز و پریشان نہ کر دے۔ اس لیے ہم نے چاہا کہ انہیں اِن کا پروردگار اِس کے بدلے اس سے بہتر پاکیزگی والا اور اس سے زیادہ محبت اور پیار والا بچہ عنایت فرمائے۔‘‘

یہاں کچھ دیر ٹھہر کر ہم غور کر لیں‘ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کی تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے اولاد نہیں لکھی۔ اس وجہ سے اُن کو پریشانی بھی ہوتی ہے‘ اور یہ فطری بات ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا غم ان کو نڈھال کیے رکھے اور محرومی کا احساس غالب رہے اور اس طرح وہ دنیا کا کوئی کام نہ کر پائیں۔

جس شخص کے ہاں اولاد نہ ہو وہ اس آیت پر غور کر لے‘ صرف اس لیے نہیں کہ اس کا غم دور ہو جائے‘ بلکہ اس لیے کہ اس کے دل کو اطمینان آ جائے اور اسے انشراحِ صدر ہو جائے‘ اور وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو اپنے حق میں رحمت سمجھے اور اسے دل سے مان لے‘ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی وجہ سے اسے اس نعمت سے محروم کیا ہے۔ اسے کیا خبر‘ اگر اس کے ہاں اولاد ہوتی تو یہ اولاد اپنے والدین کی بدبختی کا سبب بن جاتی اور انہیں پریشان کرتی‘ ان کی زندگی کو اجیرن بنا دیتی اور ان کی نیک نامی کو بٹہ لگا دیتی!

۴) حدیث میں آیا ہے کہ جب سیدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند کا انتقال ہو گیا‘ تو اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُصِيْبُهُ مُصِيْبَةٌ فَيَقُوْلُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهُ خَيْرًا مِنْهَا))

''جس مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے' پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم مطابق کہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا (ہم سب اللہ تعالیٰ کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ اے اللہ! میری مشکل پر مجھے اجر عطا فرما اور مجھے اس کے بدلے میں بہتر عطا فرما!) تو اللہ تعالیٰ اسے اس (گم ہونے والی چیز) سے بہتر عطا کر دیتا ہے۔''

سیدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو میں نے (دل میں) کہا: کون سا مسلمان ابوسلمہ سے بہتر ہو سکتا ہے؟ ابوسلمہ کا گھرانہ سب سے پہلے ہجرت کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ پھر میں نے آپ ﷺ کی سکھائی ہوئی دعا کہہ لی' تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو میرے نصیب میں لکھ دیا۔ (صحیح مسلم' کتاب الجنائز' باب ما یقال عند المصیبة، ح ۹۱۸)

اس احساس پر غور کریں جو سیدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو لاحق ہوا۔ اور اس طرح کا احساس اُن عورتوں کو پریشان کرتا ہے جو ایسے رشتوں کو کھو بیٹھتی ہیں جن سے اُن کا اسی دنیوی زندگی میں گہرا رشتہ ہوتا ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہوتی ہیں کہ میرے خاوند سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟ جب سیدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے شریعت کے حکم کے مطابق صبر کیا' اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور مسنون دعا پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے اتنا خوبصورت نعم البدل عطا فرمایا' جس کا انہوں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔

ہر مؤمن عورت کا یہی کردار ہونا چاہیے کہ وہ اپنی خوش قسمتی کو چھوٹا نہ کر لے اور نہ ہی اسے زندگی کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے یا چوکھٹ کے ساتھ باندھ لے۔ یہ بات صحیح ہے کہ وقتی غم اور مصیبت سے سب کو سابقہ پیش آتا ہے' حضرات انبیاء و رُسل علیہم السلام اس سے محفوظ نہیں رہے۔ نامناسب بات صرف یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی اور اس کی خوشیوں کو کسی ایک چیز کے ساتھ جوڑ لے' یا کسی مرد' عورت یا استاد سے نتھی سمجھ لے۔

۵) اردگرد میں پھیلے ہوئے واقعات کو دیکھیں' اگرچہ وہ بہت زیادہ ہیں' بر سبیلِ مثال ایک

واقعہ بیان کر دیتا ہوں کہ ایک آدمی ایئرپورٹ پر آیا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور سو گیا' نتیجہ یہ نکلا کہ جہاز پرواز کر گیا۔ اس جہاز میں تین سو سے زیادہ مسافر تھے۔ جب اس مسافر کی آنکھ کھلی تو جہاز تھوڑی دیر پہلے جا چکا تھا اور اس کا سفر رہ گیا۔ اسے سخت پریشانی اور شدید شرمندگی ہوئی۔ اس صورتِ حال پر چند ہی منٹ گزرے تھے کہ اس جہاز کے گر کر تباہ ہونے کی خبر آ گئی' جس میں تمام لوگ جل کر مر گئے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے: کیا پرواز کا نکل جانا اس آدمی کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوا؟ لیکن عبرت حاصل کرنے والے اور نصیحت پانے والے کہاں ہیں؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھرپور توکّل کرے اور جائز اسباب کا ممکنہ حد تک استعمال بھی کرے۔ اس کے باوجود اگر نتیجہ مرضی کے خلاف نکل آئے تو قرآنِ کریم میں بیان ہونے والے اس اصول کو یاد کر لے:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾ (البقرة)

''اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بُری جانو اور دراصل وہی تمہارے لیے بھلی ہو' اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو' حالانکہ وہ تمہارے لیے بُری ہو۔ حقیقی علم اللہ ہی کو ہے' تم محض بے خبر ہو۔''

تیسرا اصول

﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ ''تم آپس میں اعلیٰ اخلاق کو مت بھولو!''

یہ آیتِ کریمہ اخلاقیات کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول کو بیان کر رہی ہے اور اس دین کی عظمت کو بیان کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ یہ دین ہر چیز کو شامل ہے اور اس کے اصول بہت عظیم ہیں۔ سورۃ البقرہ میں احکامِ طلاق کے ضمن میں یہ آیت آئی ہے' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٧﴾﴾ (البقرة)

''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو' اور تم نے

ان کا مہر بھی مقرر کر دیا ہو‘ تو مقررہ مہر کا آدھا مہر دے دو۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ تمہارا معاف کر دینا تقویٰ کے بہت قریب ہے‘ اور آپس میں اعلیٰ اخلاق کو مت بھولو‘ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔‘‘

اس اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو حکم دے رہا ہے جن کو ایسے رشتے نے آپس میں جوڑ دیا تھا جو انسانی تعلقات میں سب سے زیادہ پاکیزہ رشتہ ہے‘ یعنی میاں بیوی کا رشتہ‘ کہ وہ جدائی اور دوری کے موقع پر بھی اپنے سابقہ تعلقات اور رشتہ کو مت بھولیں۔

پہلے ترغیب دی کہ معاف کر دیا جائے‘ چنانچہ فرمایا: ﴿اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ﴾ ’’یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے‘‘ اور اس کے بعد مذکورہ بالا قاعدہ بیان کیا‘ اور یہ سب اس لیے کیا کہ معاف کرنے کی ترغیب ہو اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے۔

عام طور پر میاں بیوی کے رشتے میں روشن پہلو غالب رہتے ہیں اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی خاطر قربانی دیتے ہیں۔ پھر اگر کسی موڑ پر پہنچ کر معاملہ طلاق تک آ جائے تو اب یہ نہیں بھول جانا چاہیے کہ اس میاں بیوی کے جوڑے میں وفا شعاری اور اعلیٰ اخلاق کا رشتہ بھی تھا۔ اگرچہ بدن ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں‘ لیکن اخلاقی تعلق تو باقی ہے‘ اور اس قسم کے پیش آنے والے حالات ان اخلاقی قدروں کو ختم نہیں کر سکتے۔

معاف کر دینے کا نتیجہ کس قدر عظیم ہے کہ وہ دور ہونے والے کو نزدیک کر دیتا ہے اور دشمن کو دوست بنا دیتا ہے۔

جب لوگوں میں اعلیٰ اخلاق کی عادت پڑ جائے تو خطا کار کے لیے اپنے گناہ کا اعتراف کر لینا آسان ہو جاتا ہے اور حقدار کے لیے معاف کر دینا آسان ہو جاتا ہے۔ اور جب لوگ اپنے حقوق معاف نہ کریں تو نتائج بھی اُلٹ ہی نکلتے ہیں۔

اگر میاں بیوی کے درمیان اس قاعدے کو اپنا لیا جائے یا ہر اُس شخص کے درمیان اختیار کر لیا جائے جس کے ساتھ ہمارا کسی بھی قسم کا تعلق ہے‘ تو زندگی خوبصورت ہو جائے۔

وفا اور اعلیٰ ترین تعلقات کی چند جوڑوں نے نادر مثالیں چھوڑی ہیں‘ اگرچہ ان کے درمیان طلاق یا وفات کی وجہ سے علیحدگی ہو چکی تھی۔

ایک مثال پیش کرتا ہوں جو مجھے معلوم ہے‘ ممکن ہے نادر مثال ہو۔ ایک آدمی کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں‘ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی جو اُس کے بچوں کی ماں بھی تھی۔ اُس نے اس طلاق یافتہ بیوی کو بچوں سمیت اوپر کی منزل میں رہائش دے دی اور خود نیچے والی منزل میں رہنے لگا‘ خود ہی بجلی اور ٹیلیفون کا بل دیتا‘ سارے گھر کا خرچہ برداشت کرتا۔ (معاملات اس قدر مثالی تھے کہ) اہل محلّہ میں سے اکثر کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ ان کے درمیان طلاق ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں اس شخص نے قرآنِ کریم کے اس حکم کی عظیم مثال قائم کر دی ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ﴾ ’’اور آپس میں اعلیٰ اخلاق کو مت بھولو!‘‘

سیرت النبی ﷺ میں ایک عظیم مثال موجود ہے‘ اور آپ ﷺ کا تو سارا کردار ہی قرآنِ کریم کی زندہ تفسیر تھی‘ کیونکہ آپ ﷺ نے قرآنِ کریم کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا تھا۔ ہوا یوں کہ آپ ﷺ طائف گئے اور وہاں کے لوگوں کو مہینہ بھر اسلام کی دعوت دیتے رہے‘ لیکن سوائے تکلیف اور پریشانی کے کچھ ہاتھ نہیں لگا‘ بالآخر مکہ مکرمہ تشریف لے آئے اور مطعم بن عدی کی پناہ میں مکہ میں داخل ہوئے۔ اس موقع پر مطعم بن عدی نے اپنے چاروں بیٹوں کو حکم دیا‘ وہ مسلح ہو کر خانہ کعبہ کے چاروں کونوں پر کھڑے ہو گئے۔ جب قریشیوں کو اس بات کی خبر ہوئی تو انہوں نے مطعم سے کہا: ’’تم اس مقام کے آدمی ہو کہ جس کی پناہ کو توڑا نہیں جا سکتا۔‘‘

مطعم بن عدی حالتِ شرک پر ہی مر گیا تھا‘ لیکن آپ ﷺ اس کا احسان نہیں بھولے‘ کیونکہ مطعم نے آپ ﷺ کو اُس وقت پناہ دی تھی جب چند لوگوں کو چھوڑ کر سارا مکہ آپ کا دشمن تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے احسان کا اعتراف اُس وقت کیا جب غزوۂ بدر ختم ہو گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’آج اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ ان غلیظ لوگوں (کافر قیدیوں) کے بارے میں سفارش کرتا تو میں اُس کی خاطر اِن سب کو چھوڑ دیتا۔‘‘ (صحیح البخاری/۳۹۷۰)

حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر مطعم مجھ سے بغیر کسی معاوضے اور بدلے کے ان لوگوں کو چھوڑنے کا کہتا تو میں انہیں چھوڑ دیتا‘ کیونکہ اُس نے مجھے اپنی پناہ میں قبول کیا تھا تو میں اس کے احسان کا بدلہ چکا دیتا۔ لوگوں کو بھلائی سکھانے والی ذات (محمد ﷺ) پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہزاروں صلاۃ وسلام ہوں۔

ہماری روزانہ کی زندگانی میں اس قاعدے کو نافذ کرنے شکلیں:

۱) کام کے مقام پر لوگوں سے تعلقات: سرکاری نوکری ہو یا نجی اداروں میں ملازمت یا

اپنی ذاتی تجارت' ہر شکل میں ہمیں دوسروں کے ساتھ اکٹھا ہونا ہوتا ہے۔ ایسا اتفاق ہوتا رہتا ہے کہ کوئی ساتھی کام سے فارغ کر دیا جاتا ہے' یا اپنی مرضی و اختیار سے وہ کام چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے۔ اِن حالات میں مذکورہ بالا قاعدے پر عمل کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ چنانچہ دونوں فریقوں کو اعلیٰ اخلاق کو فراموش نہیں کر دینا چاہیے۔ کیا ہی خوبصورت بات ہو کہ اگر ایک ساتھی یہ بات برملا کہہ دے کہ ایک وقت تک مل جل کر کام کرنے کے بعد اگرچہ ہم دور ہو گئے ہیں' لیکن اس جدائی کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ ہم باہمی محبت و احترام بھی بھول جائیں اور مشترکہ مفادات میں تعاون کو ترک کر بیٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو افراد یا ادارے جانے والے ساتھی کے احترام میں اعزازی یا الوداعی پارٹی دیتے ہیں اور اس اصول پر عمل کر کے دکھاتے ہیں یقیناً تم انہیں عظیم کہتے ہو۔ یہ ایسی خوشگوار یادیں ہوتی ہیں جو جانے والا بھول نہیں پاتا۔ اگر تم اس خوبصورت واقعے کے اثرات کو محسوس کرنا چاہتے ہو تو جو لوگ سرکاری محکموں میں یا نجی اداروں میں لمبے عرصے تک کام کرتے رہے ہوں اور جب وہ جا رہے ہوں اور کوئی ان کے بارے میں ایسا اہتمام نہ کرے' حتیٰ کہ شکریے کا سرٹیفکیٹ تک نہ دیا جائے تو ان کی نفسیاتی حالت میں جو ٹوٹ پھوٹ آتی ہے اس کا ذرا اندازہ کر لیں۔

۲) اپنے اساتذہ کے ساتھ وفا کرنا' اور طالب علم کے دل میں اچھے جذبات کا محفوظ رہنا۔ میں ذاتی طور پر ایک استاد کو جانتا ہوں جو سعودی عرب کے ایک علاقے میں خدمات انجام دے رہا ہے' اُس نے وفا کی مثال قائم کی ہے۔ اُس نے نا صرف اپنے اساتذہ کے ساتھ حسنِ معاملہ رکھا' بلکہ جب اُس کے استاد فوت ہو گئے تو آگے بڑھ کر ان کی اولاد کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کیا۔ تمہاری خوشگوار حیرت میں اضافہ ہوگا جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ اس نے سعودی عرب سے باہر سے آنے والے اساتذہ سے بھی رابطہ رکھا' خواہ ان اساتذہ کا تعلق مصر' شام یا کسی دوسرے ملک سے تھا۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کا بھلا کرے' اور امت میں اس جیسے وفا شعاروں کا اضافہ کرے۔

۳) پڑوسیوں اور اہل مسجد کے ساتھ اعلیٰ اخلاق سے پیش آنا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گوں ہیں کہ ہمیں اچھے اخلاق اور اچھے اعمال کی ہدایت دے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی اچھائی کی ہدایت نہیں دے سکتا' اور ہمیں بُرے اخلاق سے محفوظ رکھے' اور وہی بُرے اخلاق سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ (جاری ہے)

❁❁❁

حافظ نوید احمد منزل پا گئے!

ڈاکٹر ضمیر اختر خان ☆

حافظ انجینئر نوید احمد سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے مختصر وقت میں بڑا طویل سفر طے کیا۔ یہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء کا زمانہ تھا کہ نوید احمد NED یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران ہی اقامتِ دین کی جدوجہد میں لگ گئے تھے۔ کراچی کی سطح پر تنظیم اسلامی سے وابستہ چند مدرسینِ قرآن تھے جو مختلف مقامات پر درسِ قرآن کی ذمہ داری نبھاتے تھے۔ بھائی نوید نے بھی درسِ قرآن کی ذمہ داری سنبھال لی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے مخصوص اندازِ بیان سے قرآن کے پیغام کو عام کرنے میں مؤثر کردار ادا کرنا شروع کیا۔ اور پھر قرآن سے ایسے جڑے کہ حفظ کی سعادت حاصل کی اور اس کو نہ صرف اپنے سینے میں محفوظ کیا بلکہ دل و دماغ کو بھی دن رات اسی کی خدمت پر لگا دیا۔

انجینئرنگ کی ڈگری لینے کے بعد بھائی نوید کے پاس choice تھا کہ وہ دنیا کماتے۔ غالباً پاک بحریہ کی انجینئرنگ برانچ میں ان کی تقرری بھی ہو گئی تھی، مگر انہوں نے آخرت کو ترجیح دی اور ایسی کمائی کی کہ قابلِ رشک حد تک ترقی کرتے چلے گئے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ (یونس:۲۶) ''جن لوگوں نے بہتر کام کیے ہیں، بہترین حالت انہی کے لیے ہے، اور اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی۔'' نوید بھائی ''کچھ اور'' کی تلاش میں ایسے محو ہوئے کہ انہیں اپنی صحت کا بھی ہوش نہ رہا۔ اور ہوش رہتا بھی کیسے کہ ''کچھ اور'' کی جو تفسیر نبی ﷺ سے منقول ہے اس کو سن کر تو انسان بے خود ہو جاتا ہے۔ ''روح المعانی'' میں بحوالہ صحیح مسلم لکھا ہے کہ: ''جب تمام جنتی جنت کی نعمتوں سے سرشار اور ان میں مگن ہو چکے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تم سے ایک وعدہ

☆ zamirakhtarkhan@yahoo.com

کیا تھا، اب ہم اسے پورا کرنا چاہتے ہیں! جنت کے لوگ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں دوزخ سے بچا کر اور جنت عطا فرما کر سارے وعدے پورے کر دیے ہیں۔ اب کون سا وعدہ رہ گیا؟ اس موقع پر اللہ تعالیٰ اپنا حجاب ہٹا کر اپنی زیارت کرائیں گے۔ اور اُس وقت جنت والوں کو معلوم ہوگا کہ یہ نعمت تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ اور محبوب ہے جو انہیں اب تک عطا ہوئی ہیں۔''

نوید بھائی خوش قسمت تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عین عالمِ شباب میں انہیں اپنے دین کی سربلندی کی جدوجہد کے لیے قبول کر لیا تھا۔ وہ غلبہ و اقامتِ دین کی سعی و جُہد کو ہر شے پر مقدم رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیتے تھے۔ بات کھری اور سیدھی کرتے تھے، اس کی پروا کیے بغیر کہ کوئی اس کو قبول کرے گا یا مسترد کر دے گا۔

وہ اکثر اقبال کے یہ اشعار بڑے وجد میں پڑھا کرتے تھے:

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم　　قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر　　دلے در سینۂ مُلّا گدازیم

(آؤ کہ اس امت کی بگڑی بنائیں۔ زندگی کے جوئے کو مردانہ وار کھیل جائیں۔ مسجدِ شہر میں یوں آہ و بکا کریں کہ ''ملا'' کے سینے میں جو دل ہے وہ بھی نرم ہو جائے۔)

ان کی خطابت و تحریر کا انداز تقریباً ایک جیسا ہوتا تھا۔ قرآن اکیڈمی کراچی میں انہوں نے تصنیف و تالیف کا جو کام شروع کیا تھا اس کے ثمرات جلد ہی رفقاء تک پہنچنے شروع ہو گئے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کی دو خوبصورت جلدیں جب انجمن خدام القرآن سندھ کے زیرِ اہتمام چھپ کر منظرِ عام پر آئیں تو نوید صاحب کے حسنِ ذوق کی گواہی دے رہی تھیں۔ اسی طرح ''ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ اور تنظیم اسلامی، ایک تعارف'' نامی ضخیم کتاب بھی بھائی نوید کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ علاوہ ازیں فہمِ قرآن کے ضمن میں ان کی مساعی جو عربی زبان کی تدریس سے لے کر خلاصہ ہائے مضامینِ قرآن پر مشتمل تالیفات تک محیط ہیں، نیز متعدد کورسز بھی تشنگانِ علمِ دین کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوئے ہیں۔

یہ نوید بھائی کا اخلاص ہی تھا جس نے شہر کراچی میں مخلص و متحرک نوجوانوں کو غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ خیابانِ راحت، کلفٹن میں قائم قرآن اکیڈمی کے معیار اور انداز کی ایک اور اکیڈمی لیبین آباد فیڈرل بی ایریا میں قائم ہو گئی۔ قرآن مرکز کورنگی

تو نوید بھائی کی محنت پر گواہ ہے۔ یوں شہر قائد میں قرآن مجید کی اعلیٰ علمی سطح پر تعلیم و تدریس کے لیے انتہائی مستعد‘ لائق اور قدیم و جدید کے حسین امتزاج کے حامل نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔ اس وقت مختصر دورانیے کے کورسز (Short Courses) کے علاوہ ایک سالہ اور دو سالہ قرآن فہمی کورسز بھی قرآن اکیڈمیوں میں کروائے جا رہے ہیں۔

نوید بھائی دنیا سے رخصت ہو گئے‘ مگر ان کی محنت کے ثمرات سے ملک اور بیرون ملک لوگ مستفید ہوتے رہیں گے۔ اہلِ کراچی کو خاص طور پر ان کا احسان مند ہونا چاہیے‘ کیونکہ یہاں ان کے لگائے ہوئے پودے اب آہستہ آہستہ شجر ہائے سایہ دار بنیں گے۔ ان شاء اللہ!

آخر میں نوید بھائی کے سانحۂ ارتحال کے حوالے سے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ اپنی منزل پا گئے۔ انہوں نے جس بھرپور طریقے سے دین اسلام کی سربلندی کے لیے محنت کی‘ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبولیت سے نوازے گا۔ ہم ان سے عقیدت رکھنے والوں کی خدمت میں انہی کی ایک تحریر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ یہ تحریر انہوں نے اپنے استاذ و مربّی محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے سفرِ آخرت کے موقع پر رقم کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

’’ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ ان کے مشن کو نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ تیز سے تیز تر کیا جائے اور ان کے لیے صدقۂ جاریہ بننے کی سعادت حاصل کی جائے۔ عنقریب روزِ قیامت ہمیں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہونا ہے۔ یہ ملاقات خوشگوار ہو گی اگر ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مشن سے وفا کی۔ اس کے برعکس اگر اس مشن سے پہلو تہی کی تو ڈاکٹر صاحب سے آنکھیں چار کرنا ممکن نہ رہے گا اور ہمیشہ ہمیش کی شرمندگی ہماری گردن کا طوق بن جائے گی۔ اللہ ہمیں اس رسوائی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!‘‘

(ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور تنظیم اسلامی۔ ایک تعارف‘ ص ۳۸)

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

دورِ حاضر کے طالب علم میں روحانی باپ کی ناقدری کا بڑھتا ہوا رجحان

وجوہات اور تدارک

عتیق الرحمٰن قریشی

وقت ٹھہرتا نہیں بھاگتا ہے اور بھاگتے بھاگتے رشتوں اور احساسات کے معنی اور مفہوم تک کو ساتھ لے جاتا ہے۔ گلوبل ویلج (Global Village) میں جہاں بہت سے لفظوں کے معنی و مفہوم بدل گئے ہیں، وہیں عزت و احترام کے معنی اور پیمانے بھی بدل گئے ہیں۔ استاد و شاگرد کا رشتہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے ایک پاکیزہ رشتہ ہے۔ یہ رشتہ زمین پر ہی جڑتا ہے اور اس رشتے کی بنا پر شاگرد استاد سے سر سے پاؤں تک محبت کرنے میں جُت جاتا ہے اور اسے آئیڈیل مان کر اس کے بتائے ہوئے نقشِ قدم پر چلنا اپنا مقصدِ اوّلین جانتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بہترین استاد ہی شاگرد کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اسے کہاں جانا ہے؟ اور یہ کہ اس دنیا میں اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے الفاظ میں: ''استاد ہی دراصل قوم کے محافظ ہیں، کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو قوم کی خدمت کے قابل بنانا اسی کے سپرد ہے'' —— لیکن استاد کے متعلق قائم کیا گیا یہ تاثر وقت کے ساتھ ساتھ نایاب ہوتا گیا۔ آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں، اس میں علم کا تسلسل، استاد کا آنے والی نسلوں کو علم منتقل کرنے کا عزم، شاگرد کا لمحہ بھر میں سب کچھ سمیٹ کر علم کی پیاس بجھانے کی شدید خواہش تاکہ بعد میں وہ زندگی بھر تشنگی کا رونا نہ روئے، مفقود ہو چکی ہے۔ مادی منفعت، خودغرضی اور مادہ پرستی نے اگر ایک طرف رشتوں اور تعلقات کی بیخ کنی کی ہے تو دوسری طرف معاشرے میں اور خود شاگرد کی نظروں میں استاد کی قدر و منزلت کو بھی پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ استاد جو روحانی باپ کے مرتبے پر فائز تھا، اسے چند

روپیوں کے عوض ایک ملازم تصور کر کے اس سے ملازمت کروائی جانے لگی۔ آج اسے طلبہ اور ان کے والدین کی جانب سے وہ پذیرائی حاصل نہیں جو کسی زمانے میں خود اس کے اساتذہ کو حاصل تھی۔ ماضی میں جھانکا جائے تو استاد کو عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھا جاتا، اس کی راہ میں آنکھیں بچھائی جاتیں اور حالت یہ تھی کہ ؎

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض　　دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجیے!

لیکن جب خود استاد اپنے مقام و مرتبے کو بھول چکا اور اپنی ساری توانائیاں صرف اس مقصد میں کھپانے لگا کہ ''کس طرح اور کہاں سے پیسہ آتا ہے'' تو پھر شاگردوں نے بھی اپنی آنکھیں پھیر لیں اور وہ استاد کا احسان ماننے کی بجائے یوں گویا ہوئے ؎

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق　　کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے!

شاگرد آج بھی student ہی کہلاتا ہے، لیکن ٹیچر اور سٹوڈنٹ کے مابین جو رشتہ ہونا چاہیے تھا وہ رشتہ آج کی اس دنیا میں تقریباً نابود ہو چکا ہے۔ استاد اپنے آپ کو ملازم اور شاگرد کو پیسے دینے والا مالک بنا دینے میں ہی اپنا فرض اور اپنا بھلا سمجھتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اچانک نہیں ہوا بلکہ اس کی پشت پر کچھ تلخ حقائق اور وجوہات کارفرما ہیں جن کے باعث آج کے اس دور میں استاد کی حالت شکست خوردہ ہو کر رہ گئی۔ میں خود پیشے کے لحاظ سے اسی قبیل سے ہوں لہٰذا اس ضمن میں، میں اپنا مشاہدہ اور ان وجوہات کا ذکر کروں گا جن وجوہات نے استاد کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

آج اگر ایک طالب علم اپنے استاد کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، یا اسے دیکھ کر آنکھیں چراتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ استاد کا اپنا مقام سمجھنے میں کوتاہی کا مرتکب ہونا ہے۔ اگرچہ ایسی صورت میں شاگرد پر بھی فردِ جرم عائد ہوتی ہے مگر شاگرد بے چارہ کرے تو کیا کرے؟ اس کی مثال تو بقول سید ابوالحسن علی ندوی کے اس ''تانگے'' کی سی ہے جس کے چاروں طرف مخالف سمت میں گھوڑے باندھے گئے ہوں اور ہر گھوڑا اسے اپنی سمت میں کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اگر دیکھا جائے تو آج کے طالب علم کو چاروں طرف سے گمراہی نے یرغمال بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ گمراہی شکلیں بدل بدل کر اس پر یلغار کر رہی ہے، کبھی میڈیا کی صورت میں تو کبھی والدین کی صحیح تربیت نہ ہونے کی صورت میں۔ جس کا نتیجہ اس صورت میں نکل رہا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں آئے دن دنگے فساد ہو رہے ہیں، یہاں تک کہ قتل و غارت بھی ہو رہی ہے اور اس

طرح استاد و شاگرد کے آپس میں دست و گریباں ہونے کے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔
اگر ایک استاد اپنا مرتبہ و مقام سمجھنے کی کوشش کرے اور وہ اس بات کو جان لے کہ وہ پیغمبرانہ پیشے سے وابستہ ہے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ان تعلیمی اداروں سے نئی نسل کی ایک اچھی خاصی ایماندار اور باصلاحیت کھیپ تیار ہو۔ اور اگر صورت حال اس کے برعکس رہی تو وہی ہوگا جو آج کل ہو رہا ہے یعنی تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے طلبہ و طالبات ساری خرابیوں کے موجب بن رہے ہیں۔ یہ طلبہ و طالبات عملی مشین تو بن جاتے ہیں لیکن جس مقصد کے لیے انہیں تعلیم دی گئی ہوتی ہے وہ مقصد ان میں نہیں پایا جاتا۔ بقول شخصے: ''تعلیم ایک ہنر ہے جس سے ماہرین خصوصی نہیں بلکہ انسان بنائے جاتے ہیں۔''

روح کے سکون کا ایک ذریعہ تعلیم بھی ہے اور اگر صحیح معنوں میں یہ تعلیم ایک طالب علم کو نہ ملے تو انسان جانوروں سے بدتر صورت اختیار کرسکتا ہے جس کا عملی نمونہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے آج کے استاد نے محض نصاب مکمل کرنے کو اپنا مطمح نظر جان لیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنا محاسبہ بالکل نہیں کرتا۔ دیے گئے نصاب میں عدم دلچسپی کے باعث طلبہ کے پلے کچھ نہیں پڑتا، نتیجتاً طلبہ سیکنڈ ٹائم ٹیوشن لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سراسر علمی خیانت ہے کہ ایک استاد کمرۂ جماعت میں تو صحیح نہج پر اپنا فرض نہ نبھائے مگر وہی استاد ٹیوشن سنٹر میں خون پسینہ ایک کرے۔ ٹیوشن سنٹرز کے نام پر جگہ جگہ کاروبار شروع ہے۔ ان میں سے بعض تو بچوں کو ٹیوشن کی صرف ترغیب ہی نہیں دیتے بلکہ انہیں اس کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ ایسے اساتذہ اپنے شاگردوں کو سیڑھی بنا کر دنیوی دولت اور شہرت کی بلندیوں پر کمند ڈالنا چاہتے ہیں۔ بھلا یہ کون سے اساتذہ ہیں جو رات گئے تک اپنے گھروں میں ٹیوشن کا دھندا چلاتے ہیں؟ ایسے اساتذہ کا مقصد صرف اور صرف دولت اکٹھی کرنا ہوتا ہے ورنہ متعلقہ مضمون اگر وہ سکول ہی میں ایمانداری اور خلوص سے پڑھانا شروع کر دیں تو بھلا ایک طالب علم کو کیا پڑی ہے کہ وہ سکول کے بعد بھی زائد ٹیوشنز میں خود کو جکڑ لے؟ جب کوئی استاد خود کو ''استاذ'' کہلا کر ایسی کام چوری شروع کر دے تو شاگردوں میں اس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ اپنے شاگردوں کو ڈنڈے کے زور پر مسخر کرنا چاہے تو کر لے، مگر حقیقی معنوں میں اس کی عزت و تکریم دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر اساتذۂ کرام کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے تو توقع کی جاسکتی ہے کہ اساتذہ

ٹیوشن کا سہارا نہ لیں اور ہمارے اردگرد کھمبیوں کی طرح ٹیوشن سنٹرز نظر نہ آئیں۔ یاد رکھیے اس شعبے میں دنیا نہیں آخرت کمائی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اگر آج کا استاد قناعت پسند نہیں اور اسے ''هَلْ مِنْ مَّزِيْد'' کی لت پڑ چکی ہے تو میری ناقص رائے میں وہ اس پیشے کے لیے فٹ نہیں۔

طلبہ میں استاد کی ناقدری کا ایک سبب استاد کا اپنے مضمون پر کامل گرفت کا نہ ہونا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جو استاد اپنے مضمون پر کامل گرفت نہیں رکھتا وہ طالب علم کی نظروں میں گر جاتا ہے۔ وہ محض اپنی خفت چھپانے اور اپنی انا کی لاج رکھنے کے لیے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن پاک اس ضمن میں ہماری رہنمائی یوں کرتا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ (الاسراء:۳۶) ''اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑ۔'' اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ لَاَدْرِیْ ''میں نہیں جانتا'' یہ علم میں سے ہے۔

بدقسمتی سے ایسے اساتذہ محض وقت گزارنے کی خاطر کمرۂ جماعت میں داخل ہوتے ہیں اور پھر غیر متعلقہ گفتگو میں خود کو مصروف کر کے طلبہ کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ تعلیمی اداروں میں سٹاف بھرتی کرتے وقت اس بات کا سنجیدگی سے نوٹس لے اور متعلقہ مضمون کو پڑھانے کے لیے صرف ان اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں جو اپنے مضمون / متعلقہ مضمون میں متخصص ہوں۔ اس اقدام سے نہ صرف طلبہ کا وقت ضائع ہونے سے بچ سکتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ان کے دلوں میں استاد کے لیے نیک جذبات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

خصوصیات اور ذمہ داریوں سے مزین استاد آج ایک سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔ ابراہام لنکن نے استاد کی تعریف یوں کی ہے:

> ''استاد وہ ہوتا ہے جو طالب علم کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرے۔ اس میں جرأت کے ساتھ صبر و تحمل کے جذبے کو پروان چڑھائے۔ رزق حلال کمانے کا درس دے۔ اسے فطرت و قدرت کے نظاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ طالب علم کو سکھائے کہ نیکی اور بہبودِ انسانیت کے لیے ڈٹ جائے۔ ظالم کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کا حوصلہ اور سلیقہ سکھائے۔ خوشی کو محسوس کرنا جانتا ہو اور غلطی پر پشیمان ہو اور اس سے سبق حاصل کرے اور اپنی روح و ضمیر کا سودا نہ کرے۔''

ایک عظیم استاد کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

"Great teachers teach childern how to think not what to think."

ہمارے معاشرے میں استاد کو جائز مقام نہ ملنے کی جو وجوہات ہیں' سو ہیں' لیکن ان میں نمایاں طور پر استاد کا اپنا کردار اور رویہ بھی شامل ہے' مثلاً ذہنی تناؤ' گھریلو جھگڑوں اور معاشی بدحالی جیسے مسائل لیے ہوئے استاد کا خمیازہ بالآخر شاگرد کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ استاد کا یہ رویہ اسے اس کے شاگردوں کی نظروں میں دن بدن گراتا جا رہا ہے' جس سے نہ صرف ہمارا تعلیمی نظام تنزل کی جانب گامزن ہوتا جا رہا ہے بلکہ ساتھ میں طلبہ و طالبات کی ایک کثیر تعداد تعلیم چھوڑ کر منفی سرگرمیوں میں ملوث ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان میں سالانہ پینتیس ہزار بچے ان منفی رویوں اور مار پیٹ کی وجہ سے سکول سے بھاگ جاتے ہیں اور تعلیم کو مستقل طور پر خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

انسان بنیادی طور پر سہل پسند واقعہ ہوا ہے۔ وہ ہر اس چیز کو حاصل کرنے کی خواہش دل میں لیے ہوتا ہے جس کے حصول میں زیادہ محنت درکار نہ ہو۔ دورِ جدید میں موبائل' ایس ایم ایس' لیپ ٹاپ' انٹرنیٹ' فیس بک' گوگل اور ان تمام خزانوں سے جڑی معلومات کے حصول میں اگر ایک طرف ایک طالب علم نے تحقیق و جستجو کی روش ترک کر کے اپنا مقام کھو دیا ہے تو دوسری طرف استاد بھی ان خزانوں کے حصول کے لیے آسان اور مختصر راستوں کا متلاشی ہے۔ شارٹ کٹ کی اس دوڑ میں استاد و شاگرد برابر کے شریک ہیں۔ سائنسی ایجادات کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں' لیکن ساتھ میں یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جہاں ان ایجادات نے انسانوں کے لیے آسانیاں فراہم کی ہیں وہیں ان میں محنت کا جذبہ ختم کر کے انہیں سہل پسندی کا خوگر بنا کر رکھ دیا ہے۔ دورِ حاضر کے انسان میں تحقیق و جستجو کا ذوق باقی نہ رہا۔ سہل پسندی کی اس وبا نے آج کے استاد کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ کتنا اچھا وقت تھا کہ جب کوئی استاد کوئی موضوع پڑھانے جاتا تو اسے اپنے موضوع کے لیے کئی ایک کتابیں کھنگالنی پڑتیں۔ مگر دورِ حاضر کے اکثر اساتذہ نے لائبریریوں کا رخ کرنا ترک کر دیا ہے۔ آج کے استاد میں کتابی ذوق مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔ اب وہ اسائنمنٹ کے نام پر سارا بوجھ شاگرد کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے۔ شاگرد استاد کی طرف سے ملنے والی اسائنمنٹ اور اس سے متعلقہ مواد کو کتابوں میں تلاش کرنے کی بجائے انٹرنیٹ کے ذریعے دوسروں کی تحقیق اور محنت کو چرانا شروع کر لیتا ہے اور پھر بعد میں اس پر اپنے نام کا ٹھپہ لگا کر اسے اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں بہت کم طلبہ اپنے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو بروئے کار

لاتے ہیں' ورنہ ان میں اکثریت تیار نوالوں کی خوگر بن چکی ہے۔ ایک اچھا استاد اپنے شاگردوں میں سوچنے کی صلاحیت کو پروان چڑھاتا ہے' ان میں کتابی ذوق ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ کسی موضوع سے متعلق اپنے نوٹس لکھوانے کی بجائے بنے بنائے تیار نوٹس (دوسرے لفظوں میں دوسروں کی محنت) اپنے شاگردوں کے مابین تقسیم کرتا پھرے تو وہ ایک محنتی استاد کہلوانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ اور نہ ہی کوئی شاگرد ایسے کام چور اور کم ہمت استاد کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بھلا ایسے انسان کی کیا قدر ہوگی جو دوسروں کی محنت پر ڈاکہ ڈالے؟

درج بالا سطور سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ آج کا طالب علم اگر اپنے استاد کی قدر نہیں کر رہا تو اس میں شاگرد کی کوتاہی کے ساتھ ساتھ استاد بھی برابر کا شریک ہے۔ اب اگر استاد شاگرد کی نگاہوں میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرنے کا متمنی ہو تو وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ:

(۱) profession سے پہلے passion کو مدنظر رکھے۔

(۲) وہ خود کو صحیح تعلیمات سے آراستہ کرے' تب جا کر طلبہ بھی صحیح تعلیم کے نور سے منور ہو پائیں گے۔ اور اگر استاد ہی اصل اور حقیقی و روحانی تعلیم سے نابلد ہو تو سکولز' کالجز اور یونیورسٹیاں ہماری تربیت گاہ بننے کی بجائے ہماری تباہی کا ہتھیار بن جائیں گی۔

(۳) آج کے معلم کو اپنے اندر علمی لیاقت اور تدریسی صلاحیت کے ساتھ ساتھ طلبہ کی نفسیات اور طریق تعلیم سے واقفیت حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے صبر و تحمل' معاملہ فہمی' قوتِ فیصلہ' طلبہ سے فکری لگاؤ' خوش کلامی اور مؤثر انداز بیان جیسی اعلیٰ صفات سے خود کو متصف کرنا ہوگا۔

(۴) اپنے اندر پیشے سے اخلاص اور لگن' ہمدردی اور دلسوزی اور اصلاح کے جذبے کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط قائم کرنے کی صلاحیت پروان چڑھانی ہوگی۔

یہ ہیں وہ ضروری اوصاف جن سے آراستہ ہو کر ایک استاد صحیح معنوں میں استاد اور معلّم کہلائے جانے کا مستحق بنتا ہے۔ اور پھر ان اوصاف سے متصف ہو کر نہ صرف اپنے شاگردوں کے حلقے میں اسے عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے بلکہ معاشرے میں بھی اس کے لیے ہر جگہ آنکھیں بچھائی جاتی ہیں۔

❁❁❁

میری خوش نصیبی.....الحمدللہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے خوش نصیب بنایا' اس اعتبار سے نہیں کہ میرے پاس وافر دولت' زرعی زمین یا جائیداد ہے' یا میں کسی متمول گھرانے میں پیدا ہوا' بلکہ اس اعتبار سے کہ اللہ پاک نے مجھے فرمانبردار' سعادت مند' دیانت دار اور نیک اولاد سے نوازا ہے۔ میرے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی تو شادی کے بعد اپنے میاں کے ساتھ امریکہ میں ہے اور اپنے بچوں کے ساتھ خوش باش زندگی گزار رہی ہے۔ اُس کا میاں وہاں ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ وہ انتہائی متقی' فرض شناس' محنتی اور دیانت دار ہے۔ بیٹی اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ پاکستان آتی رہتی ہے۔ میں بھی اُس کے پاس گیا اور تین ماہ گزار کر آیا ہوں۔ وہ خوشحال بھی ہیں اور عبادت گزار بھی۔ اُن کی بیٹیاں وہاں پڑھ رہی ہیں اور اکلوتا بیٹا قرآن حفظ کر رہا ہے۔ بچوں کو وہ وہاں کے تعلیمی اداروں میں نہیں پڑھا رہے' جہاں بہت کم فیس ہوتی ہے' بلکہ اُن کے بچے اسلامی سکول میں بڑی فیس کے ساتھ پڑھ رہے ہیں' کیونکہ وہاں دین اسلام کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیرت سازی پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ میرے داماد کے حلقۂ احباب میں وہ نیک مسلمان شامل ہیں جن کے ساتھ اُس کی دوستی مسجد میں پانچوں وقت کی نمازوں میں حاضر ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہاں وہ اسلامی تعلیمات کو پھیلانے میں بھی کوشاں ہیں۔

میرے بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا محمود احمد ہے' اُس کو میں کالج کی تعلیم نہیں دلا سکا۔ اُس نے میٹرک کے بعد پرائیویٹ طور پر ایف اے کا امتحان پاس کر لیا اور ڈسپنسر کورس میں داخل ہو گیا اور پھر وہ دیہاتی ہسپتالوں میں کام کرتا رہا۔ وہ انتہائی فرض شناس ہے۔ کبھی اپنے فرائض منصبی سے غیر حاضر نہیں ہوا۔ ملازمت کے علاوہ گاؤں میں اس کا میڈیکل سٹور تھا۔ دیہاتی لوگ معمولی فیس کے ساتھ چھوٹی موٹی بیماریوں میں اُس سے مشورہ لیتے' اللہ تعالیٰ نے اُس کے ہاتھ میں شفا رکھی ہے۔ ڈاکٹری کے ساتھ اُس کو اس قدر لگاؤ ہے کہ وہ بڑے زخموں کو ٹانکے لگا لیتا ہے اور پھوڑے پھنسیوں اور رسولی وغیرہ کا آپریشن بھی کر لیتا ہے۔ اکاؤنٹس کے کام کے ساتھ بھی اس کی دلچسپی ہے' اس معاملے میں وہ ساتھیوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ ان کے تنخواہوں کے بل اور اُن کی

سروس بکس کے اندراجات کے سلسلہ میں ان کا مددگار رہتا ہے۔ چونکہ وہ فرض شناس اور دیانت دار کارکن تھا اس لیے اُسے مشکل اور ناخوشگوار ڈیوٹی دے دی جاتی۔ اس وجہ سے وہ نوکری سے دل برداشتہ ہو گیا اور ۵۳ سال کی عمر میں استعفا دے دیا اور نوکری چھوڑ دی۔ اُس کی رہائش شیخوپورہ شہر میں ہے۔ وہ ہر روز صبح سویرے اپنے گاؤں جنڈیالہ شیر خان میں اپنے میڈیکل سٹور پر جاتا ہے اور وہاں سے دوپہر کو واپس شیخوپورہ آ جاتا ہے' جہاں چھوٹے بھائی کے زیر انتظام ہسپتال کی فارمیسی میں کام کرتا ہے۔ وہ عبادت گزار اور ذکر اذکار میں مشغول رہتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت حسن صوت کے ساتھ کرنا اُس کا شوق ہے۔ وہ سالہا سال سے تہجد کی نماز کا پابند ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ جب اُسے کوئی حاجت ہوتی ہے وہ سحری کے وقت اپنے مالک سے دعا کرتا ہے اور وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ جنڈیالہ شیر خان میں محمود کا ایک پلاٹ تھا جو برلبِ سڑک اعلیٰ جگہ پر واقع تھا۔ اُس نے وہ مسجد کے لیے وقف کر دیا۔ اب اُس پر مسجد تعمیر ہو چکی ہے' جس کا نام مسجد کتاب وسنت ہے' جہاں قرآن وحدیث کی تعلیم ہوتی ہے اور اہل محلّہ پنجگانہ نماز ادا کرتے ہیں۔

میرا دوسرا بیٹا مسعود احمد ہے۔ گاؤں کے سکول میں اُس نے میٹرک تک تعلیم پائی۔ میٹرک کے امتحان میں آرٹس گروپ میں لاہور بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل پایا۔ اس وقت تک میرے مالی حالات میں بہتری آ چکی تھی۔ بیٹے کے نمبر بھی اعلیٰ تھے چنانچہ اُس کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا' جہاں سے اُس نے ایف اے' بی اے کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ اور پھر وہیں سے انگریزی میں ایم اے کیا اور گورنمنٹ کالج جھنگ میں لیکچرار لگ گیا۔ آج کل گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہے اور ایم فل کر چکا ہے۔ لاہور کے کئی پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بھی لیکچر دیتا ہے۔ اسلام آباد میں CSS کی ایک اکیڈمی میں بھی اُسے بلایا جاتا ہے۔ مسعود احمد کی دیانت کا یہ حال ہے کہ ایف اے کے امتحان میں خالی جگہ میں ایک لفظ لگنا تھا جو اُس کو یاد نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پاس کے ایک طالب علم نے وہ لفظ ذرا اونچی آواز میں بول دیا۔ مسعود کو بھی یاد آ گیا مگر اُس نے وہ لفظ اپنے پرچے میں نہیں لکھا کہ یہ بد دیانتی ہے۔ اگر وہ یہ لفظ لکھ لیتا تو اُسے ایک نمبر مل جاتا اور اُس کی پوزیشن آ جاتی۔

اپنے کالج میں وہ سٹاف سیکرٹری ہے' باوجود اس کے کہ اُسے اس قسم کے عہدوں میں کوئی دلچسپی نہیں' لیکن سٹاف میں اُس کی لیاقت اور نیک نفسی کی بنا پر اُسے اصرار کر کے یہ ذمہ داری دی گئی ہے۔ اُس کے شاگرد جہاں اُسے ملتے ہیں اُس کے تدریسی اسلوب اور ہمدردانہ رویے کے سبب اُسے اپنا محسن سمجھتے ہیں اور جھک کر ملتے ہیں۔

مسعود احمد اپنی وسعت کے مطابق بے سہارا لوگوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ گھر کی

خادمہ بیوہ ہے اور کئی سال سے اُن کے ہاں کام کر رہی ہے۔ مسعود نے کبھی اُس کو نہیں جھڑکا' بلکہ اُس کو سہولت دے رکھی ہے کہ جتنا کام آسانی سے کر سکو کر لو' اپنا باقی وقت کسی اور گھر کے کام میں لگا لیا کرو۔ اُس بیوہ عورت کو بازار لے جا کر اُس کی پسند کا فریج خرید دیا اور یتیم بچوں کے لیے سہولت پیدا کر دی۔ دوست احباب میں کسی کو ضرورت ہو تو وہ بلا تکلف مسعود سے رقم مانگ لیتا ہے اور وہ استطاعت ہو تو کسی کو انکار نہیں کرتا۔ مسعود کے collegues اُس کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہیں اور پرنسپل تو اُس کے کام سے بہت خوش ہے۔

مسعود احمد سخاوت اور ایثار کے معاملات کی تشہیر نہیں کرتا' اس لیے میں بھی اس معاملہ سے بے خبر ہوں۔ ادھر اُدھر سے کوئی بات پتا چل جائے تو چل جائے' ورنہ وہ اپنی یہ خوبی ظاہر نہیں کرتا۔ ایک بیوہ عورت کو سال بھر کے لیے گندم خرید کر دی تا کہ یتیم بچے سال بھر کے لیے روٹی کی فکر سے آزاد ہو جائیں۔ مسعود نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کرتا ہے اور اُس کے چھوٹے بڑے بچے بھی نماز کے پابند ہیں۔ مسعود کی طرح اس کے بچے بھی مثالی دیانت دار ہیں' کسی کا ایک روپیہ بھی ان کے پاس آ جائے تو وہ واپس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچے محلے کی مسجد میں نماز کے لیے جاتے ہیں تو نمازی اُن کے ساتھ پیار کرتے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور میرے سامنے ان کی تعریف کرتے ہیں۔

مسعود حقوق العباد کے سلسلہ میں انتہائی حساس ہے اور کسی کا معمولی سا حق بھی اپنے اوپر برداشت نہیں کرتا۔ کالج میں موجود ہو تو اپنی کلاس کو تنہا نہیں چھوڑتا اور اپنے سٹوڈنٹس کی مشکلات حل کرنے کے لیے کالج یا کالج سے باہر ہر وقت تیار رہتا ہے۔ مسعود کی دیانت کا یہ حال ہے کہ وہ یونیورسٹی امتحانات کے پیپر چیک نہیں کرتا اور نہ امتحانوں میں سپرنٹنڈنٹ کے طور پر ڈیوٹی لگواتا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اساتذہ تو کوشش کر کے یہ ذمہ داری حاصل کرتے ہیں۔ ایک پرچہ چیک کرنے میں تین چار منٹ لگتے ہیں اور معاوضہ تقریباً چالیس روپے ملتا ہے۔ اُس کا جواب تھا کہ ان کاموں میں انصاف قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔

مسعود نے اپنے بیٹے کو LUMS میں داخل کرایا۔ بیٹے نے financial aid کے لیے درخواست دے دی۔ انتظامیہ کی طرف سے جائیداد کی تفصیل طلب کی گئی تو مسعود نے اپنے کنبے کے تمام افراد کے بینک اکاؤنٹ' نقدی اور دیگر اثاثہ جات کی تفصیل لکھ دی اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ ہمارے پاس پانچ تولہ سونے کے زیورات بھی ہیں۔ کالج انتظامیہ نے یہ دیکھ کر financial aid کی درخواست مسترد کر دی۔ بیٹے کے دوستوں نے کہا زیورات لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن مسعود خوش تھا کہ سچ بولنا ضروری ہے۔

میرا تیسرا بیٹا داؤد احمد ہے جو گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہے۔ شیخوپورہ کالج سے ہی اُس نے بی اے کیا تھا اور کالج میں اول رہا تھا۔ بی اے کے بعد اس نے لاء کالج پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ابھی ایل ایل بی کی پڑھائی جاری تھی کہ اس نے ایم اے سیاسیات کا امتحان دے دیا۔ بہن کی شادی کے دن کی وجہ سے ایک پرچہ نہ دے سکا۔ اگلے سال اس پرچے کا امتحان دیا تو کامیاب ہو گیا۔ ایل ایل بی کے بعد لاء کی پریکٹس کی تیاری کر رہا تھا کہ پبلک سروس کمیشن کی طرف سے لیکچرار کی اسامیوں کا اعلان ہوا۔ داؤد بھی امیدوار ہوا اور کامیاب ہو گیا۔ اس کی تقرری گورنمنٹ کالج حافظ آباد میں ہوئی' جہاں وہ باقاعدہ حاضر ہوتا رہا۔ چند ماہ کے بعد اس کا تبادلہ ہو گیا اور اب وہ شیخوپورہ گورنمنٹ کالج میں ہے۔ کالج کے اساتذہ کے ہاں اس کی بڑی عزت ہے۔ وہ خیر خواہ اور اچھا مشیر ہے۔ اُس کے ساتھی اپنے خانگی معاملات تک میں بھی اُس سے مشورے لیتے ہیں۔ اُس کے طالب علم اُس کے مداح ہیں۔ داؤد احمد کا مضمون سیاسیات ہے' مگر وہ کلاس میں لیکچر سے پہلے ایک حدیث ضرور سناتا ہے اور بچے اُسے دہراتے ہیں۔ اس طرح اُس کے طلبہ فرموداتِ رسول ﷺ سے واقف ہوتے ہیں اور اُن کے دینی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ فرض شناس ہونے کے ناطے کوئی پیریڈ ضائع نہیں کرتا اور اس کی کلاس ہمیشہ اعلیٰ نتائج دکھاتی ہے۔ قصے کہانیوں سے اُسے نفرت ہے۔ دلچسپی قرآن اور حدیث کے ساتھ ہے۔ وہ خود نماز کا پابند ہے اور چھوٹے بڑے سارے بچے بھی باجماعت نماز پڑھنے کے عادی ہیں۔ بڑا بیٹا حفظ مکمل کر چکا ہے۔ حفظ کے بعد اسی خوشی میں میاں بیوی حافظ بیٹے کو لے کر عمرہ کرنے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وہاں داؤد حرم شریف میں بیٹھ کر بیٹے سے قرآن مجید سنتا۔ عربی لوگ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ کئی لوگ خوش ہو کر بچے کو انعام بھی دیتے۔ ایک عرب تو ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ کہنے لگا کہ میں اپنے بچوں کے سامنے آپ کے بیٹے سے قرآن سنوں گا اور اُن کو مثال دوں گا کہ تم بھی حافظ بنو۔ ہمیں وہاں معلوم ہوا کہ جس شخص کو کافی قرآن یاد ہو اُس کو حافظ کہتے ہیں اور جس کو پورا قرآن حفظ ہو اُسے حافظ کامل کہتے ہیں۔ اشعر کی عمر بمشکل سولہ سال ہے مگر حفظ کے بعد ہر سال تراویح میں قرآن سناتا ہے۔ اُس کی منزل پختہ ہے۔ داؤد ہر روز بلاناغہ اُس سے ڈیڑھ دو سپارے سنتا ہے۔ بچے کے امتحان بھی ہوں تو بھی یہ معمول جاری رہتا ہے۔ داؤد کے دوسرے دونوں بیٹے بھی حفظ کر رہے ہیں۔ تینوں بیٹے ذہین ہیں اور سکول کی پڑھائی میں بھی ان کی کارکردگی اعلیٰ درجے کی ہے۔ بڑا بیٹا حافظ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔ اُس نے میٹرک کا امتحان دے رکھا ہے۔ داؤد کی دیانت داری کا یہ حال ہے کہ اُس کے بیٹے نے میٹرک کا امتحان دیا تو شہر میں ہی اُس کا مرکز امتحان تھا' مگر داؤد اپنے بیٹے کو مرکز امتحان تک چھوڑنے نہیں جاتا تھا۔ اس لیے کہ امتحانی عملے کے

سارے لوگ اس کے جاننے والے تھے' ایسا نہ ہو کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ لڑکا داؤد کا بیٹا ہے اور اس ناطے وہ اُس کی ناجائز مدد کریں۔ داؤد کا بڑا بھائی محمود احمد حافظ بیٹے کو مرکز امتحان چھوڑ آتا اور واپس لاتا۔

داؤد کی اہلیہ ڈاکٹر ہے۔ ہماری خواہش نہیں تھی کہ وہ پریکٹس کرے مگر وہ چاہتی تھی کہ میں اپنی صلاحیت کو ضائع نہ کروں' چنانچہ پہلے پہل وہ دوسرے پرائیویٹ ہسپتالوں میں آپریشن کے لیے جاتی' پھر اُس نے اپنا ہسپتال بنالیا۔ وہ بھی خدا ترس اور ہمدرد ہے۔ وہ گائنی کی کامیاب ڈاکٹر ہے' لالچی نہیں ہے۔ وہ صرف چند گھنٹے ہسپتال میں بیٹھتی ہے اور باقی وقت اپنے بچوں کو پڑھائی میں مدد دیتی ہے۔ ڈاکٹر بیٹی ہر مہینے کے پہلے اتوار مریض خواتین کا مفت معائنہ کرتی ہے اور اپنے پاس سے دوائی بھی دیتی ہے۔ اُس دن مریضوں کے کھانے کا بندوبست بھی ہسپتال میں کیا جاتا ہے' جہاں مریضوں اور مریضوں کے ساتھ آنے والوں کو مفت دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے۔ اس روز اوسطاً ۸۰ کے قریب مریض ہوتے ہیں۔ ہسپتال میں لکھ کر لگا رکھا ہے کہ کسی بیوہ عورت سے معائنہ فیس نہیں لی جائے گی۔ اسی طرح کسی عالم دین یا امام مسجد کی بیوی ہو یا ہسپتال کے سامنے گرلز ہائی سکول کی کوئی ٹیچر ہو تو اُس سے بھی فیس نہیں لی جائے گی۔ ان اقدامات کی وجہ سے زینب ہسپتال قرب وجوار میں نیک نام ہے۔ داؤد اپنے سابقہ گاؤں میں ایک پرائمری سکول کا سرپرست ہے۔ وہاں ایک نیک دل خاتون پرنسپل ہے' جو بڑی محنت کے ساتھ سکول چلا رہی ہے۔ سکول کی اتنی اچھی شہرت ہے کہ داخلے کے لیے سفارشیں بھی رد کرنی پڑتی ہیں' کیونکہ سکول کی عمارت میں زیادہ گنجائش نہیں ہے' اگرچہ عمارت دو منزلہ ہے۔

داؤد نے وہاں لکھ کر لگا رکھا ہے کہ کوئی ہونہار بچہ جس کے والدین اُس کی اعلیٰ تعلیم کا بوجھ نہ اٹھا سکتے ہوں' وہ میرے ساتھ رابطہ کرے' جہاں تک وہ پڑھنا چاہے اُس کی تعلیم کے اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔ داؤد خود بھی فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں آگے آگے ہے۔ یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی مدد اُس کو خوش کرتی ہے۔ اس کی تفصیلات وہ مجھ سے بھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ مقامی طور پر ایک ادارہ بن رہا ہے' جہاں یتیم بچوں کی کفالت کی جائے گی' اُس کی عمارت بن رہی ہے۔ وہاں داؤد نے پانچ لاکھ کا عطیہ دیا ہے۔ دیگر فی سبیل اللہ کاموں کی طرح اس کا بھی کوئی چرچا نہیں کرتا۔ کالج کے چھوٹے ملازمین کو خوش رکھنا داؤد کو پسند ہے۔ اُن کی مدد کرنا اور اُن کو آسائش دینا بھی اُس کے روزمرہ پروگرام میں ہے۔ کبھی کبھی داؤد چھوٹے ملازمین کی دعوت کرتا ہے اور ان سے پوچھتا ہے کہ کیا کھانا پسند کرو گے؟ جو کھانا وہ چاہیں ان کو کھلایا جاتا ہے جو حقیقی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ داؤد کی طبیعت میں لالچ نام کی کوئی چیز نہیں ہے' پھر بھی اللہ تعالیٰ اُسے فراخ روزی دے

رہا ہے۔ وہ کسی سے قرض لینا پسند نہیں کرتا بلکہ با اخلاق اور خوش کردار لوگوں کو ادھار دینا اچھا جانتا ہے۔ کسی ملازم سے مفت کام کروانا اُس کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ چھوٹے ملازموں کو خوش کر کے خوش ہوتا ہے۔

میرا سب سے چھوٹا بیٹا ظفر احمد ہے۔ پرائمری تک گاؤں کے سکول میں پڑھا۔ پھر سکول چھوڑ کر قریبی مدرسے میں داخل ہو کر قرآن مجید حفظ کرنے لگا' ساڑھے تین سال میں حفظ مکمل کیا۔ اس وقت کوئی سکول اس کو داخلہ دینے کو تیار نہ ہوا کہ یہ پڑھائی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کی تیاری شروع کر دی۔ میٹرک کا امتحان ہوا تو اس نے اتنے اچھے نمبر لیے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا اور ویسے بھی یہ اپنے ان ہم جماعتوں سے جا ملا جن کو چھوڑ کر اس نے حفظ شروع کیا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ ہو کر اس نے ہیلے کالج سے بی کام کیا اور پھر امتیازی حیثیت سے ایم کام کیا۔ بعد ازاں پنجاب کالج میں لیکچرار ہو گیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں کامرس کی سیٹوں کا اشتہار شائع ہوا تو یہ بھی امیدوار تھا۔ اس کی تقرری ہیلے کالج آف کامرس پنجاب یونیورسٹی میں ہو گئی اور اب تک وہیں پڑھا رہا ہے۔ اس نے پی ایچ ڈی کا ارادہ کیا اور تین چار سال کی سخت محنت کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ اب وہ ہیلے کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہے اور دیگر کلاسز کے علاوہ پی ایچ ڈی کے طالب علموں کو بھی پڑھاتا ہے۔ وہ اپنے طالب علموں میں ہر دلعزیز ہے۔ اس کا پڑھانے کا انداز بڑا مؤثر اور سمجھانے کا طریقہ خوب ہے۔ وہ لاہور کے مشہور تعلیمی اداروں میں CA کے طلبہ کو بھی پڑھاتا رہا ہے۔ لاہور میں جگہ جگہ اس کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیں جو جب ملتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور جذبہ تشکر کا اظہار کرتے ہیں۔

ظفر کے درجنوں تحقیقی آرٹیکل ملکی اور غیر ملکی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کالج سٹوڈنٹس کے لیے اس کی کتاب Cost Accounting طلبہ اور اساتذہ میں مقبول ہے۔ وہ پاکستان سے باہر کئی بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں تحقیقی پیپر پڑھنے جا چکا ہے۔ امریکہ پانچ دفعہ جا چکا ہے۔ حال ہی میں اجمان یونیورسٹی کا دورہ کیا اور بین الاقوامی کانفرنس میں مقالہ پڑھا۔

ظفر کشادہ دست ہے۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا اور بچوں اور بڑوں کو کھانا کھلانا اس کا دل پسند مشغلہ ہے۔ کالج کے غریب بچوں کی فیس کی مد میں اور دیگر ضروریات میں مدد کرنا اس کو پسند ہے۔ کالج کے گارڈ اور دوسرے چھوٹے ملازمین اپنی ضروریات کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ظفر ان لوگوں کی پرخلوص دعائیں لیتا ہے۔ ظفر کا لاہور میں ایک کنال کا ڈبل سٹوری مکان ہے۔ اس کی خوشی ہے کہ کوئی شاگرد یا colleague یہاں اپنا کوئی فنکشن

کرلے۔ دو دفعہ یہاں اس کے شاگردوں کی شادی کی تقریب منعقد ہوئی ہے۔

ظفر مہمان نواز ہے۔ کوئی مہمان آجائے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو عمدہ سے عمدہ کھانا کھلایا جائے اور ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے بجٹ کا بھی خیال نہیں رکھتا۔ اس کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ مہمان کا اکرام روزی میں فراخی دلاتا ہے۔ ایک عمر رسیدہ مسکین حافظ قرآن تو ہر روز اس کے ہاں کھانا کھانے آتا ہے۔ اس کے بڑے بھائی محمود کی دو بیٹیاں اس کے ہاں مہمان رہیں' وہ یکے بعد دیگرے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کرکے جا چکی ہیں۔ اور اب اس کی تیسری بیٹی یہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کرکے کالج میں جاب کر رہی ہے۔ جبکہ محمود کا بیٹا یہاں رہ کر ایف ایس سی کر رہا ہے۔ بھتیجوں اور بھتیجیوں کی خدمت وہ کھلے دل سے کرتا اور ان کو ہر سہولت دیتا ہے اور ڈھیروں ثواب کماتا اور عزت حاصل کرتا ہے۔

ظفر حافظ قرآن ہے۔ اتنی مصروف زندگی کے باوجود اسے منزل اچھی طرح یاد ہے۔ تقریباً ہر سال تراویح میں قرآن سناتا ہے۔ اس کا قرآن پڑھنے کا انداز سامعین کو بڑا پسند ہے' کیونکہ تیز نہیں پڑھتا' بلکہ اس کو سننے والے قرآن کی سماعت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ اس کو قرآن مجید اچھا یاد ہے' ورنہ والدین بڑی چاہت کے ساتھ اپنے بچوں کو حفظ کرواتے ہیں مگر وہ جلد ہی بھول جاتے ہیں اور نام کے حافظ رہ جاتے ہیں۔ اِلا ماشاء اللہ!

میرے چاروں بیٹوں کے ذاتی مکان ہیں۔ دو بیٹے شیخوپورہ میں قریب قریب رہتے ہیں اور دو لاہور میں ہیں' جن کے مکان پیدل پانچ منٹ کی واک پر ہیں۔ بیٹوں کا آپس میں سلوک مثالی ہے۔ میری چاروں بہویں سلیقہ شعار' صفائی پسند اور خانگی امور میں ماہر ہیں۔ اپنے شوہروں کی تابع فرمان اور نماز روزے کی پابند ہیں۔ میری مستقل رہائش ڈاکٹر حافظ ظفر احمد کے پاس ہے مگر میں دوسروں کے ہاں بھی جاتا رہتا ہوں' جہاں میرا حد درجہ اکرام کیا جاتا ہے۔ اُن کے بچے اصرار کرتے ہیں کہ ہمارے پاس رہیں' مگر میں اپنی مصروفیات نہیں چھوڑ سکتا' لہٰذا اکثر اوقات ظفر کے ہاں ہی رہتا ہوں۔ ۲۰۰۱ء میں جب ریٹائر ہوا تو میں نے اپنی مختصر جائیداد اور نقد رقم اولاد میں برابر تقسیم کر دی' کیونکہ زندگی میں اولاد کو حصہ دیا جائے تو لڑکے لڑکیوں سب کو برابر ملتا ہے۔ اگر وفات ہو جائے تو پھر وراثت ہوتی ہے جو لڑکے کو لڑکی سے دوگنی ملتی ہے۔ میری تقسیم پر سب نے رضامندی کا اظہار کیا۔

مجھے خوشی ہے کہ (میرے چاروں بیٹے اللہ کے فضل و کرم سے رزق حلال پر کاربند ہیں) اور اپنی آمدنی میں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی جائز کمائی میں برکت دے رکھی ہے اور خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میرے بیٹوں میں سے کوئی سگریٹ نہیں پیتا اور نہ ہی اُن کی اولاد میں سے

کوئی سگریٹ پیتا ہے' بلکہ سب کو smoking سے انتہائی نفرت ہے۔ بہویں اور پوتیاں فیشن کی دل دادہ نہیں۔ ستھرا صاف اچھا اور سادہ لباس ان کو اچھا لگتا ہے۔ چاروں گھروں میں بڑے چھوٹے سب باقاعدہ تلاوت کرتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ اُن کی دعائیں اور نیک خواہشات ان شاء اللہ میرے لیے بھی اجر کا باعث ہوں گی۔ یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ خاندان کے سب لوگ توحید پرست ہیں' کسی کے ہاں بھی کوئی بدعت نہیں ملتی۔ غیر شرعی رسومات سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث' سیرت رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ زندگی نمونہ سمجھتے ہیں۔ کسی فرقے میں شامل نہیں' اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ نماز ہر مسلمان امام کے پیچھے پڑھ لیتے ہیں۔ کسی مسلمان کو کافر کہنا تو دور کی بات ہے قابل نفرت بھی نہیں سمجھتے۔ چاروں بیٹے اور بہویں حج کر چکے ہیں۔ ان کے بچوں میں سے بھی کچھ حج اور عمرے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ میرے علم کی حد تک میرے بیٹے تقویٰ شعار ہیں۔ بعض کاموں میں مجھے صحیح مشورہ دیتے ہیں جو میں قبول کرتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ نماز کی پابندی تو کرتے ہی ہیں' زکوٰۃ بھی ہر سال پورا حساب کرکے ادا کرتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ میرے کسی بیٹے کے پاس بے انداز دولت نہیں ہے۔ ہاں ان کی زندگی آسودگی اور خوش حالی میں گزر رہی ہے۔ اُن میں دولت اکٹھی کرنے اور جائیداد بنانے کی دھن نہیں ہے۔ میں اور میرا کوئی بیٹا مقروض نہیں ہے۔ ہم سب اپنے وسائل میں رہ کر گزارا کر رہے ہیں۔ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہم امیر کبیر ہیں' جبکہ ایسا نہیں۔ میرے بیٹوں کی یہ وہ خوبیاں ہیں جو میرے مشاہدے میں آئیں یا وہ leak ہو کر مجھ تک پہنچیں' ورنہ وہ نیکی کے کام ریاکاری سے بچ کر کرتے ہیں اور مجھے بھی خبر نہیں ہوتی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اعمال کو قبول فرمائے' زیادہ سے زیادہ اجر سے نوازے' اُن کو برائیوں سے بچائے اور لغزشوں' غلطیوں اور گناہوں کو معاف فرمائے۔ انہیں حاسدوں کے حسد سے' بدخواہوں کی بدخواہی سے اور نظر بد سے بچا کر رکھے۔ آمین ثم آمین۔ اللہ تعالیٰ میری خطاؤں کو بھی معاف فرمائے اور میرے والدین جو فوت ہو چکے ہیں انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جن کی تربیت نے مجھے نیک نامی سے نوازا۔

[میں نے اپنی معلومات اور مشاہدات پوری دیانت داری کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔]

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

تاریخِ خلافت

بسلسلہ "نظامِ خلافت : کیا؟ کیوں ؟ کیسے؟"(۲)

شجاع الدین شیخ☆

خطباتِ خلافت کے ضمن میں آج دوسری نشست ہے جس کا عنوان ''تاریخ خلافت'' ہے۔ اس عنوان کے تحت ہم جائزہ لیں گے کہ خلافت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور کن مراحل سے گزرتا ہوا اُمت کے کاندھوں تک پہنچا۔ اس سے پہلے کہ آج کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کیا جائے' جو تین باتیں خطباتِ خلافت کے ضمن میں پیش نظر ہیں' ان کی وضاحت ہو جائے تو بہتر ہے۔ الحمدللہ' خلافت پر گفتگو پوری دنیا میں مسلمانوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ مختلف تحریکیں اور جماعتیں اپنے اپنے طور پر اس کام پر لگی ہوئی ہیں۔ ہر وہ شخص ہمارا بھائی ہے جو غلبۂ دین کی جدوجہد میں لگا ہو' خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو اور کسی بھی جماعت میں ہو۔ ہم ہر اُس شخص کی ناکامی کی دعا کرتے ہیں جو اللہ کے دین کے خلاف سازشیں کر رہا ہو۔ ۱۹۲۴ء میں جب خلافت کا رہا سہا نظام بھی ختم ہو چکا' اس کے احیاء کی ایک تحریک برصغیر میں بھی چلی۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے امتِ مسلمہ میں فکر پیدا کی' خواہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہوں' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہوں یا اس دور کے واعظین و مبلغین ہوں' جنہوں نے اس دور میں اس بات کو واضح کیا کہ اللہ کا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے اور ربّ کی دھرتی پر ربّ کے نظام کا قیام مسلمانوں پر فرض ہے۔

ان باتوں کے عام ہونے کے نتیجے میں الحمدللہ یہ فکر عام ہو رہی ہے اور اس کے لیے تڑپ بھی پیدا ہو رہی ہے اور اس کی مختلف جہتوں پر غور و فکر بھی ہو رہا ہے۔ اس تناظر میں ہمارا فوکس تین باتوں پر ہے۔ اوّلاً یہ کہ نظامِ خلافت کا مطالبہ یا اس پر گفتگو آج کے دور کی بات نہیں ہے' بلکہ اس کی ایک تاریخ ہے۔ جب سے انسانیت کی ابتدا ہوئی' خلافت کا آغاز ہوا۔ تبھی سے نبوت کا آغاز ہوا۔ تبھی سے بغاوت کا بھی آغاز ہو گیا۔ لہٰذا اس تاریخ کو جاننا ضروری ہے۔ اس کا پس منظر کیا

☆ امیر حلقہ کراچی شمالی

ہے؟ خلافت کہاں رائج ہوئی؟ آج اس کے قیام کا فریضہ ہم تک منتقل ہو چکا ہے۔ اس پر ان شاء اللہ اس نشست میں گفتگو ہو گی۔

ہمیں خلافت کی تاریخ کو بھی سمجھنا ہے۔ یہ کوئی نیا فلسفہ یا نئی سوچ نہیں ہے بلکہ جتنی انسانیت کی تاریخ پرانی ہے' خلافت کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے۔ اس کی محنت کے لیے جوش و جذبہ بھی الحمدللہ موجود ہے۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے اس بات کا جواب دینے کی ضرورت ہے کہ اگر آج خلافت کا نظام برپا ہو جائے تو اس کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اس کا معاشرتی نظام کیا ہو گا؟ اس کا معاشی نظام کیا ہو گا؟ اس کا سیاسی نظام کیا ہو گا؟ آج کے جدید دور کے تناظر میں' جو گلوبلائیزیشن تک جا چکا ہے' ہم اگر جدید اسلامی ریاست قائم کرنا چاہیں تو اس کے خدوخال کیا ہوں گے؟

تیسری بات یہ کہ اس کے لیے جدوجہد کرنا ہم پر فرض ہے۔ ہر مسلمان چاہتا ہے کہ خلافت کا نظام قائم ہو' لیکن ہو گا کیسے؟ اس کے قیام کے لیے طریقۂ کار کیا ہو گا؟ اس کے مراحل کیا ہوں گے؟ آئندہ کے مباحث میں ان تین فوکل پوائنٹس پر گفتگو ہو گی۔

آج ہم تاریخ خلافت پر گفتگو کریں گے کہ خلافت کا سلسلہ شروع کب سے ہوا؟ کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کو جاننے کے لیے تاریخ پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ قومی عروج کے احوال کو جاننے کے نتیجے میں آج کے لوگوں میں آئندہ کے عروج کے لیے امنگ پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' خلافت کا معاملہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسانیت کی تاریخ پرانی ہے۔ آدم علیہ السلام سے قافلۂ انسانی کا سفر شروع ہوا۔ جس دن سے انسانیت کا آغاز ہوا' اسی دن سے نبوت و خلافت کا بھی آغاز ہوا۔ اسی دن اس سے بغاوت کا آغاز بھی ہوا۔ بغاوت کرنے والا شیطان تھا۔ اس کا نام عزازیل تھا' جسے ہم ابلیس بھی کہتے ہیں۔ سورۃ الکہف آیت ۵۰ کے مطابق وہ ایک جن تھا۔ یہی انسان اور جن دو مخلوقات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مکلّف ٹھہرایا ہے اور ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''ہم نے انسان اور جنات کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے''۔ یہ دونوں مخلوقات اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے امتحان میں ڈالا' دونوں کو نیکی اور بدی کا شعور دیا۔ البتہ خلافت کے منصب کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو چن لیا۔ صرف جنات ہی نہیں' فرشتوں کے مقابلے میں بھی انہیں ہی چن لیا۔

سورۃ البقرۃ کا چوتھا رکوع خلافت کے آغاز کے ضمن میں قرآن حکیم کا بہت اہم مقام ہے'

اس پر آج تفصیلی گفتگو ہوگی۔ آیت ۳۱ تا ۳۸ میں تفصیل آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے ذکر کیا کہ میں آدمؑ کو خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اس کے بعد تفصیلی واقعہ ہمارے علم میں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک عملی مظاہرہ (demonstration) کرایا۔ فرشتوں نے اللہ کے سامنے ایک سوال پیش کیا کہ اے اللہ! تو اسے اختیار دے کر زمین پر بھیجے گا تو یہ خونریزی کرے گا۔ فرشتے یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے تھے؟ واللہ اعلم‘ کہ وہ جنات کو اس سے قبل دیکھ چکے تھے‘ انہیں نیکی و بدی کا شعور و اختیار دیا گیا تھا اور انہوں نے اپنے اختیار کو استعمال کیا تو خونریزی برپا کر دی۔ فرشتوں نے سمجھنے کی خاطر یہ بات کہی کہ کہیں آدم بھی خونریزی نہ کرے! اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے۔ اس سے ایک مراد یہ لی گئی ہے کہ جن کو ہم دنیوی علوم کہتے ہیں‘ وہ آدمؑ کو سکھا دیے گئے۔ مثلاً زمین کے مسائل کیا ہیں؟ زمین میں کیا کیا وسائل ہیں؟ ان کو کس طرح استعمال کرنا ہے؟ کیسے انہیں قابو میں لانا ہے؟ یہ سب باتیں علم الاسماء میں آتی ہیں۔ اسے کسبی علم کہا جا سکتا ہے‘ یعنی وہ علم جو انسان اپنی محنت سے‘ اپنے مشاہدات‘ تجربات‘ عقل اور حواس خمسہ وغیرہ کے ذریعے حاصل کرے۔ یہ بالقُوّۃ (potentially) آدمؑ کو عطا کر دیا گیا۔ چنانچہ ہوائی جہاز‘ خلائی جہاز اور دیگر چیزیں آدم کی اولاد نے بنالیں۔ اس کا ظہور نسلِ انسانی کے آگے بڑھتے ہوئے قافلے میں ہوا۔ جب خلافت کے لیے آدمؑ کو زمین پر بھیجا جا رہا تھا تو وہاں کے وسائل کا علم اسے ہونا ضروری تھا۔ ان کو استعمال کرنے کے لیے جستجو کا مادہ ہونا بھی ضروری تھا۔

اس کے بعد آدمؑ کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ ذرا ان چیزوں کے نام تو بتاؤ۔ فرشتوں نے بڑا پیارا جواب دیا: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ﴾ (آیت ۳۲) ’’اے اللہ! تو تو پاک ہے‘ ہمارے پاس کوئی علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں عطا فرمایا ہے‘‘۔ یہ کہہ کر اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا اور خاموشی اختیار کر لی کہ یقیناً تیرے فیصلے میں کوئی حکمت ہوگی جو ہم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے فرمایا کہ آپ بتائیں! انہوں نے تمام چیزوں کے نام بتا دیے۔ وہ چیزیں کیا تھیں؟ لوگوں کو بڑی تلاش ہے۔ کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں‘ واللہ اعلم! اس سے یہ باور کرانا مقصود تھا کہ تمہارا علم محدود ہے۔ آدمؑ کو fully equipped کر کے بھیج رہا ہوں۔ شیطان نے تکبر اختیار کیا اور سجدہ نہیں کیا اور راندۂ درگاہ ہو گیا۔

آخری بات اس ضمن میں یہ کہ جب آدمؑ کو زمین پر بھیجا گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سورۃ البقرۃ کی آیت ۳۸ کے ذریعے بتا دیا کہ ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ’’جب جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے گی تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے‘‘۔ یہ حاصل کلام کے طور پر چند باتیں سرسری انداز میں میں نے آدمؑ کے واقعے کے ضمن میں آپ کے سامنے عرض کی ہیں‘ جو سورۃ البقرہ کے رکوع ۴ میں وارد ہوئی ہیں۔

اس تناظر میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنی کتاب ’’اسلامی ریاست‘‘ میں چند بڑے پیارے تبصرے کیے ہیں جن کے کچھ نکات میں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ اس واقعہ سے خلافتِ ارضی کا انسان کو سونپے جانے کے ضمن میں کیا ہدایت اور رہنمائی ملتی ہے؟ مولانا پہلی بات یہ کہتے ہیں کہ خلافت کوئی فلسفیانہ مسئلہ نہیں‘ منطقیانہ مباحث سے سمجھے جانے والی شے نہیں‘ بلکہ اس کا شعور انسان کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ پہلے انسان خلیفہ تھے‘ انہیں علم کا demonstration کرا کر بھیجا گیا۔ لہٰذا اس کی تڑپ فطرتِ انسانی میں موجود ہے‘ آج کی انسانیت چار و ناچار فطری طور پر اسی نظامِ خلافت کی طرف رواں دواں ہے۔ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیاں موجود ہیں کہ قیامت سے قبل یہ نظام کُل روئے ارضی پر قائم ہوگا۔ ان شاء اللہ! انسانیت میں اس کے لیے جو تڑپ آج ہے اس پر غور و فکر کرنے والے تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کی فلاح انسانوں کے قانون میں نہیں ہے۔ انسانوں کی فلاح انسانوں کے رب کے قانون میں ہی ہو سکتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ زمین پر انسان کا یہ فطری منصب خود مختار ہونے والا نہیں ہے بلکہ نائب اور خلیفہ کا ہے۔ انسان کو اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔

تیسری بات یہ کہ حاکمیت اللہ کے لیے ہے‘ انسانوں کے لیے نہیں ہے۔ خلافت کے مفہوم میں یہ بات موجود ہے کہ تمہیں نیابت کرنی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات اضافی طور پر سمجھ لیں کہ اسلام انسانوں کو انفرادی سطح پر یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۵۶ کے پہلے حصے ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ کا مفہوم ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں‘ یعنی دین قبول کروانے میں کوئی جبر نہیں۔ ہم بندوق کی نوک پر کسی کو کلمہ نہیں پڑھوا سکتے‘ لیکن اجتماعی سطح پر اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اپنے سوا کسی کو حاکم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قرآن میں یہ بات تین مرتبہ آئی ہے‘ سورۃ الانعام آیت ۵۷‘ سورۂ یوسف آیت ۴۰ اور ۶۷ میں فرمایا: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ کہ حکم کا اختیار اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ سورۃ الکہف میں آتا ہے: ﴿وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ کہ اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اسی بڑائی کا اعلان ہر وقت جاری ہے۔

اذانوں‘ نمازوں اور تکبیراتِ تشریق میں بار بار یہ اعلان اس لیے کیا جاتا ہے کہ سارا جھگڑا اسی بات کا ہے۔ فرعون نے (سورۃ النازعات آیت ۲۴ کے مطابق) کہا تھا: ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾﴾ کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں! نمرود نے بھی کہا تھا: ﴿اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۸) کہ میں جس کو چاہوں مار دوں اور جس کو چاہوں زندہ چھوڑ دوں! کبھی یہ اعلان قوم کی طرف سے ہوتا ہے کہ:

We are the sole supreme power on the earth .

چوتھی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے کہ چاہے وہ اللہ کا خلیفہ بنے چاہے اس کا باغی بنے۔ سورۃ الشمس میں فرمایا: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿۸﴾﴾ کہ انسان میں نیکی اور بدی کی صلاحیت رکھ دی۔ اس بنیاد پر بندے کا امتحان ہے۔ سورۃ الملک (آیت ۲) میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت و حیات کا سلسلہ قائم فرمایا تاکہ تمہیں آزمائے کہ عمل کے اعتبار سے تم میں بہترین کون ہے! زندگی امتحان کے لیے ہے۔ چاہو تو اللہ کی صحیح نمائندگی کے لیے اس کے خلیفہ بنو یا چاہو تو باغی بنو۔ نتیجہ تمہیں آخرت میں مل جائے گا۔

پانچویں بات یہ کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کرلے تو خوف اور غم ختم ہو جائے گا۔ ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ ہم نے ہواؤں میں اڑنا سیکھ لیا (ہوائی جہاز اور نہ جانے کیا کچھ بنالیے)‘ سمندروں میں تیرنا سیکھ لیا (بحری جہاز اور آبدوزیں بنالیں)‘ لیکن زمین پر انسان بن کر زندگی بسر کرنا نہ سیکھ سکے۔ غور کریں کہ سو برس پہلے ہمارے پاس جو ٹیکنالوجی تھی اور آج جو ٹیکنالوجی ہمارے پاس ہے‘ اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن ذرا بتائیں کہ سو برس پہلے مسائل زیادہ تھے یا آج زیادہ ہیں؟ ظاہر ہے کہ آج مسائل زیادہ ہیں۔ جتنی ایجادات بڑھ رہی ہیں‘ مسائل بھی بڑھ رہے ہیں..... ’’انکل آپ لیپ ٹاپ اپنے گدّے میں رکھ کر استعمال نہ کریں‘ آگ لگ جائے گی۔ موبائل فون میں سم لگا ہو تو چارجنگ کے دوران نہ اٹھائیں‘ آگ لگ جاتی ہے‘‘..... کتنا خوف بڑھ گیا ہے! ایجادات کو استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہو رہی ہے‘ لیکن مجموعی طور پر بات یہ ہو رہی ہے کہ خوف بڑھ گیا ہے‘ جبکہ ٹیکنالوجی بھی بڑھ گئی ہے۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ ہدایت والا علم بند کر دیا گیا ہے۔ تبھی یہ خوف اور غم بھی ہے۔

چھٹی بات یہ کہ اگر اللہ کی حاکمیت نہ ہو تو انسان انسان کو بیچ کھائے۔ کانگو وائرس اس وقت آیا جب اس کی vaccination تیار ہوگئی۔ وائرس پھیلا دیا اور ویکسی نیشن بیچنا شروع کر دی۔ یہ چند ٹکوں کے عوض انسانی جانوں سے کھیلنے والے ہیں‘ اس لیے کہ اللہ کا خوف ان کے دلوں میں

نہیں۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس دل سے نکل چکا ہے۔ اللہ کی بڑائی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اسی لیے تو تباہ کاریاں آتی ہیں۔ جب اللہ کا حکم نافذ نہ ہو تو فساد اور خونریزی ہوگی۔ اس خلافت کی ذمہ داری کی یاددہانی کے لیے اور اس پر عملدرآمد کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسالت و نبوت کا سلسلہ جاری فرما دیا۔ اللہ نے پہلے انسان کو نبی بنا کر ہمیں اندھیرے میں نہیں رکھا۔ باطن میں نیکی اور بدی کا شعور دیا اور ظاہر میں انبیاء و رسل علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرما دیا تاکہ اس ذمہ داری کو یاد رکھنا اور عمل درآمد کرنا ہمارے لیے آسان ہو جائے۔

اسی ضمن میں ساتویں بات یہ کہ اس ذمہ داری کے تناظر میں کامل مساوات کا معاملہ ہے۔ یہ خلافت کسی قوم‘ وطن‘ نسل‘ رنگ‘ زبان‘ نسب یا علاقے کی بنیاد پر نہیں ہے۔ اور خلافت کی ذمہ داری کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اگر کسی کو فوقیت ہے تو وہ تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ کسی کالے کو کسی گورے پر‘ کسی گورے کو کسی کالے پر‘ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں‘ سوائے تقویٰ کے۔ یہی بات قرآن‘ سورۃ الحجرات (آیت ۱۳) میں کہتا ہے کہ: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ یعنی اللہ کی نگاہوں میں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے۔ خلافت تو سب کے لیے ہے‘ لیکن ترجیح اس کو ہوگی جو صاحبِ تقویٰ ہو۔ خلیفہ کا تقرر باہمی مشورے کے ساتھ تقویٰ کی بنیاد پر ہوگا‘ جیسے قرآن نے (سورۃ الشوریٰ آیت ۳۸ میں) اہل ایمان کے لیے اصول دے دیا: ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪﴾ کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوا کرتے ہیں—— یہ وہ چند نکات ہیں جو مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں درج کیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حقیقی خلفاء تو انبیاء کرام علیہم السلام تھے۔ خلافت اللہ کے حکم کا نفاذ ہے۔ یہ حکم اللہ نے براہ راست انبیاءؑ کو دیا۔ نبوت کے ضمن میں یہ سلسلہ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی پر ختم ہوا۔ اس کے بعد ذمہ داری امت کے کاندھوں پر آ گئی۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۱۰) میں فرمایا گیا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ’’تم بہترین اُمت ہو جسے انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے‘ تم نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے‘‘۔ چنانچہ اب اس امت نے محمد رسول اللہ ﷺ کی نیابت کرنی ہے کہ ان کے پیغام کو آگے بڑھائیں‘ کیونکہ حضور ﷺ کے بعد حقیقی خلافت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن جیسے نبوت کے ختم ہونے کے نتیجے میں کارِ رسالت کی ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر آ گئی‘ ایسے ہی حقیقی خلافت جو کہ شخصی

تھی‘ ان معنوں میں کہ ہر نبی اللہ کا خلیفہ تھا‘ وہ عوامی خلافت میں بدل گئی اور یہ ذمہ داری بھی امت کے کاندھوں پر آ گئی۔ سورۃ النور میں فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص﴾ (آیت ۵۵)

’’اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے کہ وہ ضرور انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسا کہ اُس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا فرمائی۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ جن امور کی انجام دہی کے لیے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا‘ ان امور کو انجام دینا خلافت کا اصطلاحی مفہوم ہے۔ اس وقت زیر بحث نکتہ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام حقیقی معنوں میں خلفاء تھے۔ جو احکام ان تک پہنچتے تھے ان کو لوگوں تک پہنچانے اور ان کے نفاذ کے لیے جدوجہد فرماتے تھے۔ تاریخِ خلافت کے ضمن میں ہم ابتداءً مجموعی طور پر انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کر رہے ہیں اور آگے چل کر پانچ جلیل القدر رسولوں کا خصوصی طور پر ذکر آ جائے گا۔

انبیاءؑ کی ذمہ داریوں پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہر نبیؑ نے اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کی دعوت دی‘ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے ساری انسانیت کو یہ دعوت دی۔ پچھلے رسولؑ اپنی اپنی قوم کے لیے مبعوث ہوئے تھے جبکہ حضور ﷺ ساری عالمِ انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے۔ سورۃ الاعراف میں چھ جلیل القدر رسولوںؑ کا تذکرہ آتا ہے۔ ان کے ساتھ ان کی اقوام کا ذکر بھی بار بار قرآن حکیم میں آتا ہے‘ کہ حق و باطل کی کشمکش میں ایک طرف خلافت کی جدوجہد ہے جبکہ دوسری طرف بغاوت ہی بغاوت ہے۔ ان رسولوں کی جدوجہد کو قرآن بار بار نمایاں کرتا ہے۔ ان چھ رسولوں میں سے حضرات نوح‘ ہود‘ صالح علیہم السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تھے۔ ان کے بعد حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں‘ پھر حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام ہیں۔ ان کا تذکرہ سورۃ الاعراف‘ ہود‘ الشعراء اور دیگر مقامات پر کثرت سے آتا ہے۔ ان تمام رسولوںؑ نے بھی اپنی اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔ سورۃ الاعراف (آیت ۵۹) میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط﴾ ’’اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو‘ اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں‘‘۔ یعنی اپنی خواہشات کی پیروی کے مقابلے میں اللہ کی عبادت کی جائے‘ اور یہی خلافت ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت ۲۱) میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ ’’اے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو‘‘۔ حضور ﷺ کی ختم نبوت کی وجہ سے یہ

دعوت عالمگیر ہو گئی۔

اللہ کی طرف سے لوگوں پر اتمام حجت رسولوں کی دوسری ذمہ داری ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۱۶۵) میں تمام رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ط﴾ ’’ہم نے رسولوں کو خوشخبری سنانے اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے آ جانے کے بعد اب لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے‘‘۔ یعنی کل کوئی اللہ کے سامنے یہ عذرِ لنگ پیش نہ کرے کہ اے اللہ! مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ یہی کام محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں سے گواہی لی کہ میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا یا نہیں؟ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیک زبان ہو کر کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے حق وصیت‘ حق امانت اور حق نصیحت ادا فرما دیا۔ پھر انگشت شہادت اٹھا کر آپ ﷺ نے اللہ کو گواہ بنایا کہ اے اللہ! تو گواہ رہ کہ یہ گواہی دے رہے ہیں کہ تیرا دین ان تک پہنچا دیا!

تیسری بنیادی ذمہ داری جو تمام رسولوں کی تھی وہ ایک عادلانہ نظام کا قیام تھا۔ سورۃ الحدید (آیت ۲۵) میں ارشاد ہوا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ’’ہم نے تمام رسولوں کو معجزات کے ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب اور میزان نازل فرمائی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں‘‘۔ عدل کا نفاذ اُسی وقت ممکن ہے جب ’العادل‘ اور ’العدل‘ ذات یعنی اللہ تعالیٰ کا نظام زمین پر قائم ہو۔ زمین پر تین بڑے بڑے پیچیدہ ترین مسائل ہیں۔ اوّلاً مرد اور عورت کا توازن کہ اگر مَردوں کو نظام بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو وہ عورتوں کے حقوق کا استحصال کریں گے۔ اس لیے کہ مردوں کو تو عورتوں کے جذبات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح عورتوں کے ہاتھ میں نظام بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو وہ مَردوں کے حقوق کا استحصال کریں گی‘ کیونکہ انہیں مردوں کے جذبات و احساسات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ثانیاً: آجر اور اجیر کے درمیان توازن۔ اگر آجر کے ہاتھ میں نظام کا اختیار دے دیا جائے تو وہ مزدوروں کے حقوق غصب کریں گے اور اگر اجیر کے ہاتھ میں اختیار دے دیا جائے تو وہ کارخانے ہی بیچ کھائیں گے۔ ثالثاً: حاکم اور عوام کے درمیان توازن۔ اگر حاکم کو نظام بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو وہ لوگوں کو جانوروں کی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کریں گے‘ جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔ اور اگر عوام کے ہاتھ میں نظام کا اختیار دے دیا جائے تو وہ حکمرانوں کو بیچ کھائیں گے۔ تمام انبیاءؑ نے انفرادی جدوجہد فرمائی تاکہ انسانیت عدل پر قائم ہو۔

قرآن حکیم مختلف پیرایوں میں کبھی انبیاء و رسل علیہم السلام‘ کبھی نبی کریم ﷺ‘ اور کبھی آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل بیان کرتا ہے۔ ان سب نے زمین پر اللہ کے نظامِ خلافت کے قیام

کی جدوجہد برپا کی۔ مثلاً تمام انبیاء کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں آ گیا۔ رسولوں کے ساتھیوں کا ذکر سورۂ آل عمران‘ آیت ۱۴۶ میں کیا گیا ہے کہ: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ﴾ ’’کتنے انبیاءؑ گزرے جن کے ساتھ اللہ والوں نے مل کر جنگ کی‘‘۔ اللہ والا صرف وہ نہیں ہوتا جو کسی کونے میں بیٹھ کر اللہ اکبر کی صدا لگا رہا ہو اور معاشرے میں شیطان بڑا بنا بیٹھا ہو‘ ظلم وستم کا بازار گرم ہو۔ کہیں عورتوں کی عصمت پامال ہو رہی ہو اور کہیں انسانوں کو جانوروں کی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ اللہ والا تو جنگیں بھی اللہ کے لیے لڑتا ہے۔ قرآن قتال کا مقصد بیان کرتے ہوئے سورۃ البقرہ آیت ۱۹۳ اور سورۃ الانفال آیت ۳۹ میں کہتا ہے کہ: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ ’’جنگ کرو ان کے خلاف یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کے لیے ہو جائے‘‘۔ سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳ میں فرمایا:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾

’’اللہ تعالیٰ نے تمہیں دین کے بارے میں وہی حکم دیا ہے جس کی وصیت اُس نے نوحؑ کو کی تھی‘ اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپؐ کی طرف کی ہے‘ اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیمؑ‘ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو‘ کہ دین قائم کرو اور اس بارے میں کسی تفرقے میں مبتلا نہ ہو۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کا مشن قرآن حکیم نے تین مقامات پر (سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳‘ سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصف کی آیت ۹ میں بایں الفاظ بیان کیا کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

’’وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا الہدیٰ (مکمل ہدایت‘ قرآن) اور دینِ حق (مکمل نظامِ زندگی‘ اسلام) دے کر تاکہ آپؐ اسے کُل نظامِ زندگی پر غالب فرما دیں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ سے قیامِ عدل والی بات بھی کہلوائی گئی۔ سورۃ الشوریٰ (آیت ۱۵) میں فرمایا کہ: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ ’’اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں‘‘۔ اسی طرح آپ ﷺ کے صحابہؓ کا طرزِ عمل قرآن حکیم (سورۃ الفتح‘ آیت ۲۹) میں بایں الفاظ بیان ہوا: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ’’وہ کفار پر بہت شدید اور آپس میں بہت رحیم ہیں‘‘۔ اللہ کے نظام کے راستے میں رکاوٹ بننے والوں کے خلاف صحابہ کرامؓ بہت شدید تھے‘ لیکن آپس میں بہت رحیم تھے۔ سورۃ الحج (آیت ۷۸) میں ارشاد ہوا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ ’’جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔‘‘

اسی عدل کے قیام کی ذمہ داری آج امت کے کاندھوں پر ہے۔ سورۃ النساء‘ آیت ۱۳۵‘ اور سورۃ المائدہ‘ آیت ۸ میں ارشاد ہوا کہ اے ایمان والو! عدل کے قائم کرنے والے بن کر کھڑے ہو جاؤ! یہ حکم ہمارے لیے ہے۔ تاریخ خلافت کے ضمن میں تاریخ انبیاءؑ پر نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام جو شخصاً اللہ کے خلیفہ تھے‘ ان کی زندگی اسی نظام خلافت کے قیام میں لگی۔ ان کی بنیادی ذمہ داری عبادتِ رب کی دعوت اور عدل کا قیام تھا۔

قرآنی آیات کی روشنی میں ہم نے انبیاء کرام علیہم السلام کے مشن اور ان کے ساتھیوں کی ذمہ داری اور نبی اکرم ﷺ کے مشن یعنی عدل کے قیام کو سمجھا۔ سورۃ الشوریٰ کے ضمن میں پانچ جلیل القدر رسولوں کی ذمہ داری کو‘ نبی ﷺ کے مشن کو‘ آپؐ کے عدل کے نفاذ کی ذمہ داری کو اور اہلِ ایمان کی ذمہ داری اور اہل ایمان کے عدل کے نفاذ کی ذمہ داری کو سمجھا۔

قرآن حکیم انبیاء و رسل علیہم السلام کے قصے اور واقعات بیان کرتا ہے۔ یہ ہے وہ حق و باطل کی کشمکش یعنی خلافت و بغاوت والی کشمکش جہاں انبیاءؑ اور ان کے ساتھی حق کی دعوت دیتے ہوئے‘ اس پر آنے والی مخالفت پر ڈٹے ہوئے اور جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں بھی سنتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو کہا گیا کہ تمہیں ماننے والے تو غریب غرباء ہیں۔ معاذ اللہ! حضور ﷺ کے بارے میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو رسالت کے لیے ایک یتیم ہی ملا ہے‘ اس کو مکہ‘ مدینہ اور طائف کے سردار نہیں ملے! یہ سب کچھ حق و باطل اور خلافت و بغاوت کے معرکے میں ہوا۔ یہ ساری تاریخِ انبیاءؑ تاریخِ خلافت ہے۔

اب آتے ہیں سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف جس میں پانچ جلیل القدر انبیاء کرام حضرت نوح‘ حضرت ابراہیم‘ حضرت موسیٰ‘ حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد ﷺ کا ذکر ہے‘ جن کو قرآن حکیم نے ایک خوبصورت عنوان ’’اولو العزم من الرسل‘‘ یعنی رسولوں میں عالی ہمت رسول دیا۔ یہ اصطلاح سورۃ الاحقاف کے آخر میں بھی استعمال ہوئی۔ فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (آیت ۳۵) ’’(اے نبی ﷺ!) صبر کیجیے جس طرح عالی ہمت رسولوں نے صبر کیا تھا‘‘۔ اس پر تھوڑی سی گفتگو کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دور میں جو نظامِ خلافت قائم ہوا اس کی چند جھلکیاں دیکھیں گے۔

سورۃ الشوریٰ کی مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ ’’اے مسلمانو! تم کو وہی حکم دیا جا رہا ہے جس کی وصیت اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کی اور جس کی وحی (اے نبی ﷺ!) آپ کو فرمائی‘ اور جس کی وصیت ہم نے حضرات ابراہیم‘ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو فرمائی کہ دین کو قائم کرو اور اس بارے میں کسی تفرقے میں مبتلا نہ ہو‘‘۔ ان پانچ انبیاء و رسل علیہم السلام کے حالات کو قرآن نے بار بار بیان کیا۔

ان انبیاء میں پہلا نام حضرت نوح علیہ السلام کا لیا گیا۔ ان کی ہمت اور عظمت کا عالم یہ ہے کہ ان کے نام پر ایک پوری سورت سورۂ نوح قرآن پاک میں موجود ہے' جس میں اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی فریاد نقل ہوئی ہے کہ اے میرے رب! میں نے ان کو دن میں بھی پکارا' رات میں بھی پکارا' ان کو انفرادی طور پر بھی پکارا' اجتماعی طور پر بھی پکارا' ہر ہر موقع پر پکارا' لیکن میری قوم نے میری دعوت قبول نہیں کی۔ ۹۵۰ برس تک استقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹے رہے اور انجیل کے بیان کے مطابق کوئی ۸۰ افراد ان کو میسر آئے۔ گویا ۱۳۔۱۴ سال میں اوسطاً ایک آدمی نے دعوت قبول کی۔ نتائج کو دیکھیں کہ بیوی نافرمان تھی۔ چار بیٹوں میں ایک نافرمان تھا۔ طوفان کے دوران پکارتے رہے کہ بیٹا آ جاؤ! لیکن وہ نہیں مانا۔ یہ اللہ کا امتحان تھا' جس میں حضرت نوح علیہ السلام اور کشتی میں سوار افراد کامیاب ہوئے۔ نہ ماننے والے ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے۔ اللہ نے انہیں غرق کر دیا۔ دنیا کو دکھا دیا کہ اللہ اپنے ماننے والوں کو بچا لیتا ہے اور نہ ماننے والوں کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ کوئی تو وجہ ہے کہ ہم نماز میں درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں۔ کبھی غور کیجئے گا' ایک بڑا نازک پہلو ہے۔ ہم پڑھتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ .....

''اے اللہ! محمد ﷺ پر رحمتیں نازل فرما اور آلِ محمد ﷺ پر اپنی رحمتیں نازل فرما' جس طرح تو نے رحمتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آلِ ابراہیمؑ پر.....''

''آل'' اولاد کو بھی کہتے ہیں اور پیروکاروں کو بھی' جیسے قرآن میں ''آلِ فرعون'' کہا گیا۔ فرعون ہی غرق نہ ہوا آلِ فرعون بھی غرق ہوئے۔ آلِ فرعون کا مطلب فرعون کی اولاد نہیں بلکہ اس کے پیروکار ہیں جو غرق ہوئے۔

قرآن سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے امتحانات کی خود گواہی دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۴ میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾

''یاد کرو جب ابراہیمؑ کو ان کے رب نے بعض باتوں میں آزمایا' پس وہ ان میں کامیاب ہو گئے۔ (جب امتحانات سے گزر گئے تو) فرمایا: میں تمہیں انسانیت کا امام بنانے والا ہوں۔''

یہ صلہ انہیں عظیم قربانیوں کے بعد ملا ہے۔ آپؑ کی پوری زندگی امتحانات سے بھری ہوئی ہے۔ آپؑ نے شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں آنکھ کھولی۔ باپ بت پرست و ستارہ پرست تھا۔ اس ماحول میں آپؑ نے نعرۂ توحید بلند کیا: ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا

وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (الانعام) ''میں نے تو اپنا چہرہ اس ہستی کی طرف پھیر لیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں''۔ قرآن نے یہ گواہی بھی دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں پوری امت تھے۔ بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر توحید کا نعرہ بلند کیا۔ باپ کو پورے ادب کے ساتھ دعوتِ توحید پیش کی۔ جواب میں اُس نے انہیں گھر سے نکال دیا۔ قوم بھی جان کے درپے ہو گئی۔ آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو گئے۔ گھر بار' وطن سب کچھ چھوڑا۔ اللہ کے حکم پر اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو مکہ کے بیابان میں چھوڑ دیا۔ اپنے تیرہ برس کے بیٹے (حضرت اسماعیل علیہ السلام) جو بڑھاپے کا سہارا ہے' اس کی گردن پر اللہ کے حکم سے چھری چلانے کے لیے تیار ہو گئے۔ خلافت کے ضمن میں توحید کے دو بڑے بڑے مراکز قائم کر دیے۔ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں اور سیدنا اسحاق علیہ السلام کو فلسطین میں آباد فرمایا۔ ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام سے ان کے بارہ بیٹے اور اس نسل سے ہزاروں انبیاء و رسل علیہم السلام پیدا ہوئے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طرزِ عمل ہے۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آتے ہیں' جن کے بارے میں ۵۵۰ سے زیادہ آیات قرآن کریم میں آئی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم سے پہلے اُمت مسلمہ بنی اسرائیل تھی۔ ہماری رہنمائی اور عبرت پذیری کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے حالات قرآن حکیم میں تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔ بنی اسرائیل اور ہمارے واقعات ملتے جلتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے بھی دو ادوار ہیں' ایک ہجرت سے قبل اور دوسرا ہجرت کے بعد کا۔ اور بھی بہت سارے اعتبارات سے دونوں میں یکسانیت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا مشن ایک بگڑی ہوئی امت کو فکری اور جسمانی غلامی سے نجات دلانا اور ان کو اللہ کی اطاعت میں لانے کی کوشش کرنا تھا۔ بنی اسرائیل مسلمان تھے۔ اللہ کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ فرعون کے غلام تھے۔ چنانچہ غلامی کے نتیجے میں ان میں فکری بگاڑ بھی پیدا ہو گیا تھا اور وہ جسمانی طور بھی غلام تھے۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں کھڑے ہو کر اسے دعوتِ حق پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ قوم کی اصلاح کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہجرت بھی کراتا ہے اور محفوظ بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تورات بھی عطا فرماتا ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے قتال کا مطالبہ کیا تو بدقسمتی سے قوم نے قتال سے انکار کر دیا' جس کے نتیجے میں قوم پر اللہ کا عذاب بھی نازل ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا مشن اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی میں لانا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دورِ رسالت چند ہی سالوں پر محیط تھا۔ ان کے دور میں یہ امت انتہا پسندی کی انتہا پر تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشن ایک دنیا پرست اُمت میں تزکیۂ نفس کی کوشش کرنا

تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے آخری رسول تھے‘ جس نے اللہ کی کتابوں میں تحریف کی‘ دین کا سودا کیا۔ دنیا میں مگن ہوکر دین کو بیچ ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تمہاری حالت ان قبروں کی طرح ہے جن کے اندر کھوکھلی ہڈیاں ہوتی ہیں اور اوپر سے ان پر چونا پھیر دیا جاتا ہے۔ ظاہر میں تمہاری بڑی جاہ وحشمت ہے‘ سیادتیں اور قیادتیں ہیں‘ لیکن اندر خانے کھوکھلی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام دنیا کی محبت لوگوں کے دلوں سے نکال کر اللہ کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دعوت کے بارے میں آپؑ نے بہترین مثالیں پیش کیں۔ آپؑ کا مشہور جملہ ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مار دے تو دوسرا گال بھی پیش کردو۔ میں تمہیں حق کی بات پہنچانا چاہتا ہوں۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہی جذبہ ان کے پیروکاروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ رفق‘ ہمدردی‘ کسی کی مشکل کو دیکھ کر تڑپ جانا اور اس کے حل کی کوشش کرنا‘ یہ مثالیں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے قائم فرمائیں۔

آخر میں رسولِ اکرم ﷺ کا معاملہ۔ اس شان کے ساتھ آئے کہ بقول غلام مرتضیٰ ملکؒ آپؐ تن تنہا کھڑے ہوگئے۔ دنیا میں انقلاب پانچ دس فیصد لوگوں کے ذریعے آتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے تھے کہ مکمل انقلابی جدوجہد صرف آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں دکھائی دیتی ہے۔ آپ ﷺ نے توحید کا نعرہ بلند کیا۔ جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا ان کی تنظیم بنائی۔ ان کی اس طور سے تربیت کی کہ اللہ ہی مطلوب ومقصود ہو جائے‘ ان کی ساری محنت آخرت کے لیے ہو۔ اس لیے کہ زمین پر اللہ کا نظام لانا ہے تو اس کے لیے اللہ والے درکار ہوں گے۔ جب تک طاقت میسر نہیں آ جاتی اس وقت تک تمام مصائب کو برداشت کرنا ہے۔ مکہ مکرمہ کے تیرہ برس اس کی بہترین مثال ہے۔ ہجرت کا مرحلہ بھی آیا۔ پھر قتال کا حکم بھی آ گیا۔ غزوۂ بدر سے قبل آٹھ سرایا روانہ کیے گئے۔ تجارتی راستوں پر رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ پھر قتال کا مرحلہ آیا۔ قرآن کی گواہی سورۂ بنی اسرائیل‘ آیت ۸۱ میں آ گئی کہ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ ’’حق آ گیا اور باطل مٹ گیا‘ اور باطل تو ہے ہی مٹنے کے لیے‘‘۔ اور سورۃ النصر میں فرمایا: ﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ ’’اور تم لوگوں کو فوج در فوج دین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھو گے‘‘۔ یہ ۲۳ برس کی جدوجہد تھی۔ جب آغازِ وحی ہوا تو بہترین نفع بخش تجارت کا سلسلہ ختم کر دیا اور اپنی زندگی دین کی جدوجہد کے لیے وقف کر دی۔ پھر بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت جو انہوں نے آپ ﷺ کی ملکیت قرار دے دی تھی‘ ساری کی ساری اسی کام میں صرف کر دی۔ اس راستے میں شدید تکالیف برداشت کیں۔ سجدے کی حالت میں پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈالی گئی۔ آپ ﷺ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اتنا کھینچا گیا کہ آپؐ کی آنکھیں

اُبل پڑیں۔ آپ ﷺ اپنے گھر میں موجود تھے کہ بکری کی بچہ دانی کی غلاظت آپؐ کو تاک کر ماری گئی۔ آپ ﷺ کو ’نعوذ باللہ‘ شاعر‘ جادوگر اور جھوٹا کہا گیا۔ آپ ﷺ کی دو بیٹیوں کو طلاق دے دی گئی۔ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر انتہا درجے کا ظلم وستم ہوا۔ حضرت یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما کو انتہائی بے دردی سے شہید کیا گیا۔ آپ ﷺ کو روتی آنکھوں کے ساتھ بیت اللہ شریف کو الوداع کہنا پڑا۔ اُحد کے میدان میں آپ ﷺ کا خونِ مبارک بہا۔ آپ ﷺ کو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا لاشہ اٹھانا پڑا اور یہ کہنا پڑا کہ اس نوجوان کی شان دیکھو‘ ایک وقت تھا کہ اس کا لباس شام سے ڈھائی تین سو درہم میں لایا جاتا تھا‘ آج اس کے پاس کفن کے لیے لباس کم پڑ رہا ہے‘ سر ڈھانپا جاتا ہے تو پیر کھلے رہ جاتے ہیں اور پیروں کو ڈھانپا جاتا ہے تو سر کھلا رہ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے سر کو ڈھانپ دو اور پیروں پر گھاس ڈال دو۔ وہاں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا لاشہ بھی موجود ہے جن کا کلیجہ نکال کر چبایا گیا۔ ۲۵۹ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن کی جانوں کا نذرانہ پیش کیا گیا‘ تب وہ نظامِ خلافت اپنی پوری شان کے ساتھ بتمام وکمال نافذ ہوا۔

جب کارِ رسالت کی ذمہ داری رسول اللہ ﷺ نے امت کو یہ کہہ کر منتقل فرمائی کہ ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) جو یہاں موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں‘ تب صحابہ کرامؓ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکل پڑے۔ نظامِ خلافت کی توسیع اور اس کی برکات کو انہوں نے دنیا والوں تک پہنچایا۔ ان کی قبریں دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو آدھی دنیا مسلمانوں کے زیرنگیں رہی۔ اغیار کو کہنا پڑا کہ اگر اسلام کو ایک عمرؓ اور مل جاتا تو ساری دنیا مسلمانوں کے قدموں تلے ہوتی۔

پانچ جلیل القدر رسولوں کی جدوجہد کا محور ومرکز اسلام کے عادلانہ نظامِ خلافت کا قیام تھا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جب سے انسانیت کا آغاز ہوا خلافت اور نبوت کا آغاز ہوا۔ نبوت ختم ہوئی محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ پر‘ لیکن کارِ رسالت جاری ہے جو کہ ہماری ذمہ داری ہے۔ خلافت شخصی محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہوئی اور خلافت راشدہ سے عوامی خلافت کا دور شروع ہوا۔ آج ہم پر نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے‘ کیونکہ دنیا کے خاتمے سے قبل حضور ﷺ کی پیشین گوئیوں کے مطابق خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کل روئے ارضی پر قائم ہونی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین! (جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

عابداللہ جان کی معرکہ آراء تصنیف

AFGHANISTAN:
The Genesis of the Final Crusade

کارواں اردو ترجمہ:

افغانستان
آخری صلیبی جنگ کا نقطۂ آغاز

ترجمہ و تفہیم
محمد فہیم

★ دیدہ زیب ٹائٹل ★ معیاری طباعت ★ امپورٹڈ پیپر

صفحات 348 قیمت 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)